فقہِ اسلامی اور عصرِ حاضر

(مقالہ برائے ایم۔ فل)

پیش کردہ

سعید اختر کاظمی

ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات شیعہ

زیرِ نگرانی

سیّد کاظم نقوی

پروفیسر و صدر شعبۂ دینیات شیعہ

شعبۂ دینیات شیعہ (فیکلٹی دینیات)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۹۲ء

M A
BRA

MAUL ... AZAD LIBRARY
Acc. No.
DS 2437
Aligarh Muslim University, Aligarh

DS2437

زمانہ مسلسل رواں دواں ہے اور زندگی کا کارواں اسکا ہمرکاب و ہمسفر ہے۔
زمانہ کی نیرنگیاں نت نئے حالات و کوائف کو جنم دیتی ہیں اور متغیر زندگی کے تقاضے نئے نرالے
روپ میں سامنے آتے ہیں، انسان حیوان مطلق نہیں کہ فطرت کے ٹکے بندھے اصولوں پر
لاشعوری طور پر زندگی بسر کرے اور مرجائے، نہ غم امروز نہ فکر فردا، انسان بہرحال انسان ہے،
اور عقل و شعور نے اسے حیوانی دائرہ سے نکال کر اشرف مخلوقات کی معراج بخشی ہے،
اسی کے بل بوتے پر انسان قدرت کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کرتا ہے
اور اسی کی بدولت اس کا ذوق تحقیق و جستجو سرگرم عمل ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ فکر انسانی کا ہمہ جہتی سفر جاری ہے، یہ نہ کبھی
تھکتی نہ کہیں رکتی ہے، یہ نہ کسی منزل پر ٹھہرتی، نہ کہیں بس کہتی ہے، یہ منزل کو بھی
جادۂ منزل سمجھتی اور کائنات کی وسعتوں پر محیط ہونا چاہتی ہے، یہ ہردم جواں،
ہردم رواں دواں رہتی ہے اور جو چیز راہ کا روڑا بنتی، اسے ٹھکرا کر آگے بڑھتی ہے،
اس پر سنگین پہرے بٹھائے جائیں تو بغاوت پر اتر آتی ہے، اسے مقید و محبوس
رکھا جائے تو بپھر کر قید و بند کی زنجیریں اور طوق و سلاسل کے حلقوں کو توڑ پھینکتی ہے،

یہ اور بات ہے کہ سخت گیر شکنجوں کی بدولت ذہنی اختناق جنونی کیفیت اختیار کرلے اور اسے اپنے پرائے، دوست دشمن کی تمیز نہ رہے۔

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ عیسائی مذہبی پیشواؤں نے اپنے خود ساختہ کلیسائی مذہب کے ہاتھوں ارباب فکر و دانش اور صاحبان تحقیق و جستجو پر عرصۂ حیات تنگ کیا، انھیں دار و رسن کی منزلوں سے گزارا اور موت کے گھاٹ اتارا۔

کلیسائی مذہب کے زیر قیادت انقیوزلیشن "INOUSITION" (محکمۂ تفتیش عقاید) کے وحشیانہ مظالم نے آسمانی مذاہب کو شدید دھچکا پہنچایا، جاہل عوام نیز ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے ہر طبقے کے لوگوں کے دلوں میں عام طور پر مذہب کی طرف سے نفرت بیٹھ گئی۔

ہر وہ شخص جو اپنے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتا ہے وہ مظلوم کے دل میں دل ڈال کر اس کی قلبی واردات و کیفیات اور کربناک دھڑکنوں کو سنتا اور محسوس کرتا ہے۔ اہل کلیسا یا دیگر مذاہب کے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا

نشانہ بنائے گئے مفکرین کے حق میں جذبۂ ہمدردی اور ظالم سے نفرت و بیزاری کا پیدا ہونا فطری تقاضہ ہے۔ دل کی گہرائی سے ہم بھی اس کا اظہار کرتے اور مظلوم طبقے کے پسماندگان کے ساتھ برابر کے شریک غم اور سوگوار ہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ شدت غم میں بھی عقل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ آندھی، طوفان اندھے ہوتے ہیں، جو بھی ان کی زد میں آتا ہے اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، آدمی بھی غصے میں اندھا اور شدت غم سے پاگل ہو جاتا ہے، اسے نہ اچھا برا سوجھتا ہے، نہ حق و ناحق کی تمیز رہتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک بات بھی ہے اور تعجب خیز بھی، کہ جس طبقے نے اپنی محیر العقول دانش و بینش کے ذریعے کائنات کی مستور حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہو اور قدرت کی انوکھی، اچھوتی حسین رعنائیوں سے سرگوشیاں کی ہوں، انھوں نے حقائق کا تجزیہ کیے بغیر تمام مذاہب کو ایک جیسا کیسے سمجھ لیا، جو عقل و تدبّر، حق و انصاف اور اصول تحقیق کے سراسر منافی ہے۔

ارباب دانش و بینش کا کہنا ہے کہ مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک مذہب خود ساختہ عقاید و نظریات، لایعنی رسوم و عبادات

اور اوہام وخرافات کا مجموعہ ہے۔ مذہب جنھیں مسلمہ حقائق بتاتا ہے ان میں سے کوئی بھی چیز سائنسی تجزیہ وتحلیل کی گرفت میں آنے کے قابل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب جہاں کہیں بھی مذہب و مذہبیات نام کی کوئی چیز زبان پر آتی ہے، فوراً یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بھی منجملہ مہملات ایک چیز ہوگی۔ اوروں کا کیا ذکر، مذہب اسلام کو دیکھیے جو اپنے کو دین فطرت کہتا ہے، اس کا بھی یہ دعویٰ سیاست دانوں کے خوش کن کھوکھلے نعروں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اسلام انسانی مساوات کا نعرہ لگاتا ہے، لیکن اسلامی دور میں بھی سرزمین عرب پر جو شخص اونٹوں، بھیڑ بکریوں، کھجور کے باغوں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ کنیزوں، غلاموں کا مالک نظر آتا ہے، وہی زیادہ مالدار اور صاحب عزت ووقار سمجھا جاتا ہے، جنگ میں قیدی بنائے ہوئے مرد وزن، غلام وکنیز قرار دیے جاتے رہے، بردہ فروشی کو اسلام نے نہ یکسر ختم کیا اور نہ اسے ممنوع قرار دیا۔ اسی طرح مساوات قائم کرنے کے بجائے اس نے مرد وزن کے حقوق وفرائض میں امتیاز برتا، خواہ عقد وطلاق کا معاملہ ہو یا میراث وعبادات کا، ہر جگہ دورنگی پالیسی ملتی ہے۔

اسلام بڑے شد ومد سے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ فکری ونظری مذہب ہے، اس کے اصول وفروع فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں، عقل وشعور کی

تسکین اور ذوق تحقیق و جستجو کی تشنگی کے لیے چشمۂ آب حیواں ہیں، مگر جب ہم اسلام و اسلامیات کا جائزہ لیتے ہیں تو ڈھیروں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو عقل و شعور کے مطابق نہیں ہیں۔

کہا تو یہ جاتا ہے کہ اسلام نہ ذہنوں پر پہرے بٹھاتا ہے، نہ عقل و شعور پر قدغن لگاتا ہے، مگر جب کوئی مسلمان عقل آرائی سے کام لے کر امور دین میں کچھ ردوبدل یا ترمیم و اضافہ کرنا چاہتا ہے تو مفتیان دین متین کفر کے فتووں سے نوازتے ہیں۔

اسی طرح قرآن ایک طرف تو کہتا ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ[1] (اللہ تمہارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمہارے لیے دشواری پیدا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا) یا لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا[2] (خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔ دوسری طرف آسانیوں کے بجائے قدم قدم پر دشواریاں پیدا کی جاتی ہیں، چنانچہ جاڑا ہو یا گرمی اور برسات،

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵ [2] سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۶

روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا لازمی ہے، شدت کی گرمی ہو یا معتدل موسم؛ ہر سال ایک مہینے رمضان کے روزے رکھنا ضروری ہیں، قریب کا رہنے والا ہو یا دور کا، صاحب استطاعت کو زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا لازمی ہے میراث کا وارث، مستغنی ہو یا فقیر، بچہ ہو یا جوان، ہر ایک کو حصہ رسدی ہی حق ملیگا، اریے جناب "فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ وَ اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْھَرْ"[1] (یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا) کی تلقین کرنے والا اسلام، بیٹوں کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کو میراث دینے کے لیے ذرہ برابر روادار نہیں، خواہ بیٹے پہلے سے مالدار اور پوتا بے چارہ غریب و ناداری کیوں نہ ہو۔

مذہب؛ جامد، ناقابل تبدیل ضابطوں کا نام ہے اور دنیا تغیر پذیر ہے، دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے، انسانی معاشرہ بھی اسی طرح تغیر پذیر ہے لہذا بدلتے ہوئے معاشرہ کے قوانین ناقابل تغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسلام بھی ایک مذہب ہے جو خود یہ اعلان کر رہا ہے فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا[2] یعنی اللہ کے طور طریقے

---

[1] سورۃ الضحیٰ آیت ۹ ۱۰ [2] سورۃ الفاطر آیت ۴۳

(قانون، دستور) میں تبدیلی اور تغیر ہرگز نہ ہوگا۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ قوانین ضرورت کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں اور انسان کے مجموعی ضروریات پائیدار و یکساں نہیں ہیں، تو پھر اجتماعی قوانین کیسے پائیدار و یکساں اور قابل تغیر و تبدل ہو سکتے ہیں؟

اسلام زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، اسکے قوانین ٹھوس ہیں، ان میں وقتی تقاضوں کو اپنے میں سمونے کا لوچ اور لچک نہیں ہے۔

اسلامی اصول عقاید، عبادات، عمومی زندگی سے متعلق قوانین سب ناقابل تبدیل ہیں، نیز اصول عقاید و عبادات میں دین کا عمل دخل ہونا تو قرین قیاس ہے، لیکن عوامی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اپنے پرائے، جدید تعلیم یافتہ اور روشن خیال علماء سب کا یہ خیال ہے کہ سیاست، مذہب سے الگ ہے، نیز اسلام نے سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں اور صریح احکام دیے ہیں، انھیں حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا اور توڑا جا سکتا ہے، اس لیے کہ سیاست، معیشت اور معاشرے کے مسائل میں ہمیشہ ارتقا ہوتا رہتا ہے، اس ارتقا کا ساتھ دینا

ضروری ہے۔ ورنہ مسلمان اور اسلامی ممالک تمدنی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی بدحالی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ بات اسلامی روح کے منافی ہے۔

روشن خیال مسلمان طبقہ کا کہنا ہے کہ مذہب زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا تو اتاترک کمال پاشا کو کیوں مغربی نظام حکومت اپنانا پڑتا، کمال پاشا تو آزاد خیال مسلمان تھے، عام مخلص مسلمانوں کے نزدیک تو غیر مسلم حاکم وقت بھی واجب الاطاعت اولی الامر کا درجہ رکھتا ہے۔

زمانہ راکٹی تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے شش جہات عالم میں علم و آگہی کے تنصیبات سگنل دے رہے ہیں، زندگی کے ہر ہر شعبے اور کائنات کے ہر ہر گوشے میں جدید تحقیقات اور انکشافات و ایجادات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے، کل کی ثابت حقیقتیں موجودہ سائنس کے ہاتھوں پاش پاش ہو چکی ہیں۔ آج کا انسان اپنے علم و دانش کی کمندوں سے چاند تاروں کی دنیا کو اسیر کر رہا ہے، زہرہ و مریخ کی بلندیوں پر اپنا پرچم لہرا رہا ہے، مگر قدامت پسند

---

[1] فلسفۂ شریعت اسلام (مولوی احمد رضوی) ترجمہ فلسفۃ التشریع فی الاسلام (ڈاکٹر صبحی محمصانی بیروت) ص: ۸۳

علماء اسلام بقول مولانا آزاد "ہنوز افلاطون و ارسطو کے در کی جاروب کشی میں مصروف ہیں، فکر و نظر کا معیار کچھ سے کچھ ہوگیا، ذہنوں کے سانچے یکسر بدل گیے مگر یہ عصر حاضر کے مسائل فرسودہ کتابوں سے حل کرنا چاہتے ہیں اور نئے سوالات کے جوابات پرانی کتابوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ پچاس برس پہلے حالات و خیالات کچھ اور تھے اب کچھ اور ہیں، پہلے نظریات بدل گیے، سائنس و ٹکنالوجی کے زمین و آسمان بدل گیے، تہذیب و تمدن کی دنیا بدل گئی، زندگی کی قدریں بدل گئیں معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات بدل گیے، زندگی کے تقاضے بدل گیے، مگر ہمارے مدارس کا عقیم نصاب تعلیم علیٰ حالہ باقی ہے۔"[۲]

اسلام نے تہذیب و تمدن کی چمن بندی کی ہے، انسانی قدروں کو استوار اور انسانیت کو قید وحشت سے آزاد کیا ہے، اس کے برخلاف کلیسائی نظام کے تحت عیسائیت نے عقلیت، جبلیت، فطرت اور تہذیب کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں، اسی کی بدولت مذہب مطعون و مردود بنا، مگر زمانہ کی ٹھوکر سے اسکی

---

[۲] "مولانا آزاد کی ایک آرزو" رسالہ جامعہ دہلی، اپریل ۱۹۶۳ء

آنکھیں کھل گئیں، تہذیب جدید کا بول بالا ہوا تو خوش آمدید کہتے ہوئے جدید عیسائیت نے اس کا استقبال کیا اور علوم جدیدہ و جدید انکشافات و اکتشافات کے لیے اپنا دروازہ کھول دیا، مگر افسوس صد افسوس کہ وہ اسلام جس کی فطرت کا خمیر علم و آگہی سے اٹھا ہو اور جس نے تفکر و تدبر کو انسانیت کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہو اس کے کلمہ گویوں نے علوم جدیدہ اور جدید انکشافات و اکتشافات کو اپنے لیے شجر ممنوع سمجھ لیا اور مدارس نے "درس نظامی" کو قرآنی آیات متصور کر لیا، حالانکہ قرآنی آیات میں بھی زمان و مکان کے اعتبار سے ناسخ و منسوخ کی گنجائش رکھی گئی ہے، مگر ہمارے مدارس کل کے کل "درس نظامی" کو آیات محکمات باور کیے ہوئے ہیں، انھوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں فرمائی کہ فلسفۂ یونان کے عروج کے موقع پر اس وقت کے علمائے اسلام نے جو طریقۂ کار اور رنگ استدلال اختیار کیا اور نصاب تعلیم مرتب کیا تھا وہ علمائے ماسلف سے بعینہٖ انھیں ورثہ میں نہ ملا تھا، تو پھر آج فلسفۂ جدید اور علوم جدیدہ سے صرف نظر چہ معنی دارد ؟

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں غیر مذہبی درسیات کو آثار قدیمہ کے طور پر لعینہٖ برقرار رکھنا دین و ایمان سمجھ لیا گیا ہو، وہاں زندگی کے دیگر اسلامی معاملات میں کسی قسم کی تبدیلی و ترمیم کو کیسے گوارہ کیا جا سکتا ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ علماء مدارس نہ علوم جدیدہ سے واقف ہیں، نہ جدید طرز استدلال کے مدارک سے، لہٰذا ان کا مفاد اور عافیت اسی میں ہے کہ جدید علوم کو حدود مدارس میں داخل نہ ہونے دیا جائے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم و انتم لا تعلمون ۵ (عجب نہیں کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بُری ہو اور اللہ تو جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جاتی اور مدارس کے نصاب میں سماجی علوم کا جدید نظریۂ تحقیق، اس کے اصول اور طریقے نیز فلسفۂ جدید کی اعلیٰ تعلیم کو بھی شامل کیا جاتا، قدیم و جدید نظریات کے تجزیے و تحلیل کے لیے دانشوروں کے خدمات حاصل کرنے کے امکانات

---

۵ سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۶۔

پیدا کیے جائیں اور باہمی افہام و تفہیم کے بعد مشترکہ اجتماعی فیصلے لیے جاتے تو قدامت و جدیدیت کی درمیانی خلیج بھی پُر ہو جاتی۔ آج کل میڈیکل سائنس میں ایک ایک عضو بدن کے لیے الگ الگ شعبے اور اس کے الگ الگ ماہرین ہوتے ہیں، یونیورسٹی میں مختلف فیکلٹیاں اور ان کے ذیلی شعبے در شعبے ہوتے ہیں، اگر مختلف شعبوں کے مسلمان دانشوروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے کر عصری مسائل میں ان سے متعلق خدمات حاصل کیے جائیں تو نہ فقط درمیانی خلیج پٹ جائے گی بلکہ بہت کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی۔

عائلی زندگی، بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی، شادی کی عمر، خاندانی منصوبہ بندی، آزادیٔ نسواں، حق طلاق، اباحت پسندی، لڑکے لڑکیوں کی مخلوط تعلیم، نظام حکومت میں عورتوں کی شرکت، دفتروں وغیرہ میں ملازمت، تفریحی مشترکہ مشاغل، رقص و سرود کی محفلیں، سنیما، تھیٹر، عورتوں مردوں کی مخلوط اداکاری، مجسمہ سازی، تصویر کشی، سودی تجارت، سودی بینکنگ ذخیرہ اندوزی، مستقبل کے سودے، سٹہ، معمہ بازی، لاٹری، بیمہ، پگڑی، پوسٹ مارٹم، اعضا کی تبدیلی، خون چڑھانا، مصنوعی ذرائع تولید و تناسل وغیرہ جیسے عصری مسائل

باب اجتہاد پر ڈیرہ ڈالے، دھرنا دیے بیٹھے ہیں اور اپنے بارے میں شریعت کے موقف کی مانگ کر رہے ہیں، مگر مسلمانوں میں ایک مدت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے، عصری تقاضے دروازہ کھٹکھٹا رہے، سُم سُم کُھل کی صدا لگا رہے ہیں، مگر ارباب حل وعقد صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ[۲] کی تلاوت اور ورد میں مشغول ہیں۔ یہ وہ اعتراضات ہیں جو روشن خیال مسلمان طبقے کی جانب سے اسلام اور فقیہان اسلام پر کیے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس دنیائے رنگ و بو میں انگنت مذاہب نے جنم لیا، ان میں سے بہت سے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے، مگر تمام مذاہب کا کلیتاً نابود نہ ہونا اور اس لامذہبی دور میں بھی کچھ مذاہب کا باقی اور جاری وساری رہنا بتاتا ہے کہ مذہب سے فکر انسانی کا یقیناً فطری لگاؤ ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض مذاہب نے اس فطری طلب کو افراط وتفریط کا آلۂ کار بنا لیا جس سے واقعی حقیقت مشتبہ ہو گئی، لیکن حقیقت پسند انسان کے لیے یہ

---

[۲] سورۃ البقرہ آیت ۲۱۶۔

زیبا نہیں کہ وہ بدگماں ہو جائے اور اپنی بے لوث سائنٹفک تجزیہ و تحلیل کی ذمہ داری کو بروئے کار لائے بغیر صرف اپنے قیاس و گمان کے بل بوتے پر کوئی فیصلہ لے لے اور اسے ایک کلیہ کی شکل دے دے۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلام بھی انگنت فرقوں کی آماجگاہ ہے اور ہر ایک فرقہ دوسروں کے باطل اور اپنے تئیں برحق ہونے کا دعوی دار ہے، مگر حقیقت حال یہ ہے کہ صداقت صرف اور صرف کسی ایک سے وابستہ ہے اور اسی کو دین برحق "اسلام" کہلانے کا حق پہنچتا ہے۔

مجھے نہ کسی اور مذہب کی وکالت کا حق حاصل ہے اور نہ وہ میرا موضوع بحث، البتہ دین حق اسلام کے بارے میں پوری ذمہ داری اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ :

اسلام نہ کوئی خواب پریشاں ہے، نہ بیگانۂ حقیقت داستاں، یہ نہ کوکین ہے نہ پنسلین، نہ افیون ہے، نہ ہیروئن، بلکہ عقاید و اعمال کی ٹھوس حقیقتوں کا مجموعہ اور ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو دینی اور دنیاوی تقاضوں اور زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں پر محیط ہے، بلکہ زندگی و موت اور حیات

بعد الموت تک کے مسایل اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

اسلام نہ فکر انسانی کو محبوس و مقید رکھنا چاہتا اور نہ ایسا دیکھنا چاہتا ہے، بلکہ کائنات کی لامحدود وسعتوں اور پہنائیوں میں اسے سیر کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام فکر انسانی کو گونگا، بہرا، اندھا بنا یے رکھنے کا حامی نہیں، بلکہ انفس و آفاق میں قدرت کی نشانیوں کو دیکھنے، ان کی سرگوشیوں کو سننے، سمجھنے اور جاننے کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام اندھی تقلید کو ناپسند کرتا اور آباؤ اجداد کے مسلک پر بلا سوچے سمجھے قایم رہنے کی مذمت کرتا ہے۔

اسلام فکری جمود کا مخالف ہی نہیں، بلکہ اس کو رواں دواں دیکھنا چاہتا اور کائنات میں بکھری قدرت کی انگنت نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

اسلامی شریعت کا محور و مرکز ہی فکر انسانی ہے، فاتر العقل، نابالغ اور مدہوش انسان، قانون اسلامی کی پیروی کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں، ان کا مرفوع القلم اور

غیر ذمہ دار ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عقل سلیم، فکر صحیح اور بالغ نظری ہی اسلام کے نزدیک قابل اعتبار و اعتماد ہے اور شریعت میں اسی کی عملداری و حکمرانی ہے۔

"فقہ اسلامی" کی تعریف، اس کی ژرف نگاہی، طریقۂ کار اور دائرۂ عمل سے بھی یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام خالص تعبّدی امور تک میں غور و فکر، عقل و تدبّر اور استدلال سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے، اگرچہ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ عقل و تدبر سے کام لینے اور عقل آرائی کے درمیان فرق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شرعی احکام میں "فکری اجتہاد" ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اسی لیے شریعت نے اسے واجب کفائی قرار دیا ہے، تاہم فلولا نفر من کلّ فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقّھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلّھم یحذرون [۲] (کیوں نہ ایک جماعت ہر طبقے سے نکلے اور دین کی سمجھ پیدا کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو انجام کار سے ڈرائے تاکہ یہ لوگ ڈریں۔) سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دینی امور میں غور و فکر پر

---

[۲] سورۂ توبہ آیت ۱۲۲۔

پابندی نہیں لگاتا، بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے۔

فقہ کے لغوی معنی :

الفقہ : العلم بالشی والفہم لہ کسی چیز کا جاننا اور سمجھنا۔

الوقوف والاطلاع کسی چیز کی واقفیت اور اطلاع ہونا۔

الحذق والفطنۃ مہارت و زیرکی۔

احکام شریعت کا ادلۂ تفصیلیہ سے ماننا [۱]

فقہ کی مشہور اصطلاحی تعریف :

العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ [۲]

فقہ : (ان احکام شرعیہ کے جاننے کو کہتے ہیں جن کا تعلق انسانی اعمال سے ہے، البتہ انکی الگ الگ دلیلوں کے ذریعہ۔)

امام ابوحنیفہ نے یہ تعریف کی ہے :

الفقہ "معرفۃ النفس ما لھا وما علیھا" [۳]

فقہ : نام ہے نفس کے لیے مفید اور نقصان رساں چیزوں کے پہچاننے کا۔

کہا جاتا ہے کہ اس تعریف کے لحاظ سے فقہ صرف عملی قانون کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ

---

[۱] المنجد، تاج پبلشرز، دہلی [۲] قوانین الاصول، المقدمۃ فی تعریف اصول الفقہ

[۳] التوضیح والتلویح مع حاشیۃ الجلبی ص: ۲۵ / زبدۃ الاصول، ص: ۳
محب اللہ بن عبد الشکور بہاری مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
کشاف اصطلاحات الفنون ۱: ۳۰
(تھانوی)

اس میں پورا دین داخل ہے، خواہ اس کا تعلق عقاید و اخلاق سے ہو، یا معاملات و معاشرت اور عبادات سے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فقہ کی یہ تعریف قرآن مجید کی آیت لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت [۱] سے مستفاد ہے۔

اس تعریف کی رو سے فقہ کا موضوع صرف نفس کیلئے مضر و مفید امور ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ افعال جو نفس کے لیے مفید یا مضر نہیں ہیں، ان سے فقہ کو کوئی سروکار نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ نفس کیلئے مفید و مضر چیزوں کی معرفت کیوں کر حاصل ہوتی ہے؟ خود بخود کشف و الہام اور القا سے یا کسی اور طرح سے؟ اس تعریف سے یہ بات معلوم نہیں ہو پاتی۔

قرآن مجید کی آیت فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون [۲] (کیوں نہ ایک جماعت ہر طبقے سے نکلے اور دین کی سمجھ پیدا کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو انجام کار سے ڈرائے تاکہ یہ لوگ ڈریں)

---

[۱] سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶ [۲] سورۃ توبہ آیت ۱۲۲

اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہر طبقے سے ایک جماعت تفقہ فی الدین حاصل کرے یعنی دینی امور میں سمجھ بوجھ سے کام لے اور یہ بات ظاہر ہے کہ "دین" محض چند رسمی عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کے تمام شعبوں اور حیات بعد الموت کے مسایل پر محیط ہے تو پھر تفقہ فی الدین کو عبادات، ایقاعات اور معاملات میں کیسے محدود کر دیا گیا ؟

اسکے علاوہ آیۂ قرآنی وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[۵] (جن و انس کو نہیں پیدا کیا گیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں) سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ رسمی عبادات کے علاوہ دیگر امور زندگی بھی اگر مرضی و منشائے خالق کے مطابق انجام پائیں تو وہ بھی منجملۂ عبادات محسوب ہوں گے، اس لیے کہ عبادت سے عبارت صرف رسمی اعمال بندگی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ بلا کم و کاست مسلسل عبادت میں صرف ہونا چاہیے اور یہ ناممکن ہے، اس لیے کہ بقائے حیات کے لیے ضروریات زندگی کی فراہمی اور انجام دہی بھی بجائے خود ایک لازمی امر ہے، اگر ضروریات زندگی کی انجام دہی کے

---

۵ سورۃ الذاریات آیت ۵۶

بعد پھر مصروف عبادت ہونا فرض کر بھی لیا جائے تو بھی ضروریات کی انجام دہی کے بقدر توقفِ عبادت بہرحال ناگزیر ہے، جو سراسر منافیٔ مقصدِ تخلیق ہوگا۔

یہاں ایک اور بات سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے کہ جب منشائے الٰہی کے مطابق جملہ امورِ زندگی کی انجام دہی منجملۂ عبادت ہے تو پھر "دینی امور" اور "دنیاوی امور" کی تفریق چہ معنی دارد؟

ہو سکتا ہے یہ تفریق اس اعتبار سے ہو کہ اس دنیائے دنی سے متعلق امور کو "دنیاوی امور" سے اور آخرت سے متعلق امور کو "دینی امور" سے موسوم کیا گیا ہو، اگرچہ کسی مادی کام کا روح کی شمولیت کے بغیر اور روحانی امر کا مادہ و جسم کی وساطت کے بغیر وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں، تاہم جو چیزیں جسم کی نمو و بقا کی ضامن ہیں انھیں مادی اور دنیاوی امور اور جو چیزیں روح کی بالیدگی و ارتقا اور تزکیۂ نفس کی آئینہ دار و ذمہ دار ہیں انھیں روحانی امور سے تعبیر کرنا غیر مناسب بات نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں اس وقت مختصر طور پر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ یہ سچ ہے کہ دین زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے، لیکن علم فقہ میں انسانی اعمال سے بحث ہوتی ہے اس لیے

تفقد فی الدین کا مطلب یہاں یہ ہے کہ جملہ افعال کی انجام دہی کے وقت دینی احکام کو پیش نظر رکھا جائے، اسی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

ہر مذہب میں عبادت کا بنیادی مقصد تقویٰ و تزکیۂ نفس ہے، اسی سے صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے، اسلام میں یہ فلسفہ بدرجۂ اتم موجود ہے، بلکہ اسلامی فلسفہ کی یہی روح ہے، بعثتِ رسول کی غرض و غایت بھی آیات کی تلاوت، کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیۂ نفوس ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتٰب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین[1]

اللہ وہی تو ہے جس نے جاہلوں میں، ان ہی میں کا ایک رسول (محمدؐ) بھیجا جو ان کے سامنے اسکی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اگرچہ اسکے پہلے یہ لوگ صریحی گمراہی میں مبتلا تھے۔

پیغمبر اسلامؐ نے خود بھی اپنی غرضِ بعثت مکارم اخلاق کی تکمیل بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

بعثتُ لاتمّم مکارم الاخلاق[2] — میں عمدہ اخلاق کو مکمل کرنیکے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

---

[1] سورہ جمعہ، آیت ۲ [2] باب مکارم اخلاق و سیرۃ و سنۃ، بحار الانوار ج ۱۶ ص: ۲۱۱

نماز کے لیے ربّانی ارشاد ہے : انّ الصّلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر[1] (بیشک نماز بدکاری اور برے کاموں سے باز رکھتی ہے)

روزہ کے متعلق قرآنی ارشاد ہے : کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلّکم تتقون[2] (تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے، تاکہ تم متقی بن سکو۔)

الغرض سب جگہ یہی نظریہ اور مقصد جلوہ نما ہے، بلکہ دیگر ادیان کے مقابلہ میں اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے اس مقصد کو صرف عبادات ہی میں منحصر نہیں رکھا، بلکہ شخصی افعال، ایقاعات و معاملات اور تمام شعبہ ہائے حیات میں یہ روح کارفرما ہے۔

اسلام نے جن امور کو واجب و مستحب قرار دے کر انھیں اختیار کرنے کی تلقین کی ہے وہ چیزیں ایسی ہیں جو انسان کی انسانیت، اخلاق حمیدہ کو فروغ اور جلا بخشتی ہیں، جن چیزوں کو حرام دیکر ان سے باز رکھا گیا ہے، وہ چھوت کی بیماری کی طرح انسانیت کے لیے مضر اور مہلک ہیں۔

---

[1] سورہ عنکبوت آیت ۴۵ [2] سورۃ البقرہ آیت ۱۸۳

محتاط طبیب بہت کم بیمار پڑتا ہے، وہ اپنے مزاج سے بھی واقف ہوتا اور خورد و نوش کی چیزوں نیز اشیائے مستعملہ کے خواص سے بھی واقف ہوتا ہے، اس لیے جو چیزیں اس کے لیے مفید ہوتی ہیں انھیں استعمال کرتا اور نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ یہی حالت اسلامی شریعت کی بھی ہے وہ واجب و مستحب اور مباح چیزوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتی اور مکروہ و حرام چیزوں سے باز رہنے اور پرہیز کرنے کی تلقین کرتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ صالح مزاج، صالح کردار اور صالح معاشرہ ہی اسلام کا مطمح نظر ہے۔ الٰہی توفیق جس کے شامل حال ہوتی ہے، وہ علم فقہ یعنی دینی سمجھ بوجھ سے نوازا جاتا ہے، چنانچہ حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوتا ہے:

من یرید اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین[1]

اللہ جس بندے کی بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرماتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

الحسین بن محمد عن جعفر بن محمد عن القاسم بن الربیع عن مفضل بن عمر قال سمعت اباعبداللہؑ

مفضل بن عمر کا کہنا ہے کہ میں نے حضرت ابوعبداللہؑ

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم، ص: ۳۲
مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۴ھ

یقول علیکم بالتفقہ فی دین اللہ ولا تکونوا اعرابا فانہ من لم یتفقہ فی دین اللہ لم ینظر اللہ الیہ یوم القیمۃ ولم یزک لہ عملا ۔ [1]

کہ یہ فرماتے سنا کہ تمہیں دین الٰہی میں غور و فکر لازم ہے، اعرابی نہ بنو، اسلئے کہ جو دین میں سمجھ بوجھ سے کام نہ لیگا روز قیامت اللہ کی نظر رحمت اسکی طرف نہ ہوگی اور نہ اسکا کوئی عمل پاکیزہ قرار پائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام؛ ایک دین، ایک مذہب ہے، اگر ہر مذہب ایک افیون ہے، جو قوائے عقلیہ کو مضمحل اور ناکارہ بنادیتی ہے، تو اسلام کو کیا ضرورت تھی کہ وہ مسلمانوں کو تلقین کرے کہ سمجھ بوجھ سے کام لیں، اسکے علاوہ جو حضرات شرعی احکام کے مصادر و ماخذ اور طریقۂ استنباط سے واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ نظری امور اور شرعی مسایل کے سمجھنے سمجھانے اور استنباط احکام کے سلسلے میں قرآن و حدیث اور اجماع کی طرح عقل کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے، مگر اس سے مراد عمومی عقل نہیں ہے، یہ تو ہر آدمی کے پاس موجود ہے عقل سے مراد ہے وہ فکر جو اوہام پر غالب ہو، ان سے مغلوب نہ ہو، یہی عقل و دانش، ذوق و وجدان بصیرت و تفقہ سب کی رہبر ہے، یہ فکری قوت ہی انسان کی فعّال قوتوں کا سرچشمہ، ساری معنوی قوتوں پر متصرف، ان پر حکمراں اور ان کی روح رواں ہے، اسی کے اشاروں پر ساری قوتیں گردش کرتی ہیں، اسی کی بدولت انسان کائنات پر متصرف اور جملہ مخلوقات سے

---

[1] کتاب فرض العلم، اصول کافی، ص: ۱۶

برتر ہے۔

قوت فکر ہی کے ذریعے انسان حقائق کا تجزیہ کرتا، اسی کے ذریعے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کرتا، جزئیات کو جمع کر کے کلیات بناتا ہے، اسی سے جزئیات کے نتائج کو سمجھتا، دنیا و آخرت کے انجام کو جانتا، انسانی فلاح و بہبود اور معاشرے کی اصلاح کی تدابیر سوچتا ہے۔

یہی فکر خدائی قوانین کی نکتہ داں، معرفت الٰہی کی نکتہ رس، حقائق نبوت کی رمز شناس ہے، یہی فکر و بصیرت اسلام کی روح رواں ہے اور یہی اس کی حیات جاوداں، یہ نہ ہوتی تو "اجتہاد" کا دروازہ ہمیشہ کیلیے مسدود اور احکام شرعیہ کا استخراج و استنباط ختم ہو جاتا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی ہر طاقت و صلاحیت کی طرح اس کی عقل اور فکر و تفکر کی قوت بھی محدود ہے اور جب کسی طاقت پر برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے، تو وہ جواب دے دیتی ہے۔ اسلام نے "اصول دین" کے میدان میں عقل کی جولانی کے لیے وسیع مواقع فراہم کیے ہیں، ان میں "تقلید" جائز نہیں ہے، لیکن "فروع دین" تعبدی امور ہیں، خالق کو اپنی اطاعت کا جو طریقہ مطلوب ہے،

اسی عنوان سے بے چون وچرا بجالانا ضروری ہے، اگر ہر ایک کی اپنی پسند پر اس کو چھوڑ دیا جاتا تو روز ازل سے لے کر ابد تک پیدا ہونے والے انسانوں کے بقدر انگنت عبادت کے انداز ہوتے اور کسی ایک فرقہ کی عبادت میں یکسانیت کا کیا سوال، ایک ہی شخص کی عبادت کے من مانے نہ جانے کتنے روپ ہوتے۔

اسلام اپنے دامن میں عقاید و اعمال کی دنیا لیے ہوئے ہے، مگر نہ اس کے عقاید لایعنی، نہ افعال غیر حکیمانہ، عقاید، فکری بے راہ روی کیلیے "رہنما اصول" اور اعمال، صالح معاشرے کی تشکیل کیلیے سنگ میل ہیں یوں تو سارے دینی، نظری اور عملی امور و نظریات کو اسلام اور اسلامیات اور دین و دینیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن دوسری صدی ہجری میں مختلف علوم وفنون کی الگ الگ تدوین ہوئی تو آنکھوں سے اوجھل، مابعد الطبیعاتی نظریات واعتقادات، بالفاظ دیگر اصول دین سے متعلق علم کو "علم کلام" سے موسوم کیا گیا اور فروع دین یعنی عملی امور سے متعلق علم کو "فقہ" سے تعبیر کیا گیا، یہی علم فقہ اسوقت ہمارا موضوع بحث ہے، اسکی لغوی اور اصطلاحی تعریف پیش کرنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانی افعال جو علم فقہ کا موضوع ہیں وہ کس کس نوعیت کے ہوتے ہیں اور

ان کے کیا احکام ہیں ۔

انسانی افعال و اعمال جن سے شرعی احکام متعلق ہوتے ہیں چار طرح کے ہوتے ہیں[۵] :

۱۔ عبادات ۲۔ شخصی افعال ۳۔ ایقاعات ۴۔ معاملات

عبادات : وہ افعال جو خدا اور بندے سے متعلق ہیں اور ان کا صحیح ہونا اللہ سے قریب ہونے (قربۃ الی اللہ) کی نیت سے بجالانے پر موقوف ہوتا ہے ۔

انتہائی اہم عبادتیں چھ ہیں :

دو نوری جسمانی : یعنی نماز و روزہ

دو خالص مالی : یعنی خمس و زکوٰۃ

دو ملی جبلی : حج و جہاد

شخصی افعال : جن افعال کے بجالانے میں قصد قربت (قربۃ الی اللہ کی نیت) یا

---

۵ شرائع الاسلام

صیغے کی ضرورت نہ ہو، جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا وغیرہ۔

ایقاعات: جو افعال صرف ایک فریق سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کے واقع ہونے میں صیغے کی تو ضرورت ہوتی ہے قبول کی نہیں، جیسے طلاق، عتق، ہبہ، صدقات وغیرہ۔

معاملات: جو افعال دو فریقوں سے متعلق ہوتے ہیں، یعنی صاحبان معاملہ دو فرد ہوتے ہیں، ایک کی طرف سے ایجاب، دوسرے کی طرف سے قبول ہوتا ہے، یہ ایجاب و قبول خواہ لفظوں میں ہو یا محض وقوع فعل اس کا کاشف ہو، جیسے نکاح اور خرید و فروخت۔

مذکورۂ بالا چار قسموں کے افعال میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہونے کے اعتبار سے پانچ طرح کے احکام ہو سکتے ہیں:

واجب، مستحب، مباح، مکروہ، حرام

واجب: وہ پسندیدہ بات جسے اختیار کرنا لازمی، اسکے بجالانے میں ثواب اور ترک میں عذاب ہو۔

مستحب : وہ پسندیدہ بات جس کا بجالانا لازمی تو نہ ہو البتہ بہتر ہو، اس کے کرنے میں ثواب، اور ترک میں گناہ نہ ہو۔

مباح : وہ کام جس کا کرنا بھی جائز اور ترک بھی جائز۔

مکروہ : وہ ناپسندیدہ بات جس کا ترک بہتر ہو، اسکے ترک میں ثواب ہو اور بجالانے میں عذاب نہیں۔

حرام : وہ ناپسندیدہ بات جس کا بجالانا قطعاً ممنوع ہو، اس کا ترک باعث ثواب اور بجالانا موجب عذاب ہو۔

انسانی افعال و اعمال خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، مذکورۂ صدر چار اقسام میں سے کسی نہ کسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم فقہ کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اسکے رسولؐ نے، اللہ اور رسولؐ کے حقوق ادا کرنے، ان کے ساتھ معاملات کرنے اور آپس میں تعلقات قایم کرنے کے کیا قوانین و ضابطے اور آداب و شرائط مقرر فرمایے ہیں، یعنی سارے انفرادی و اجتماعی امور سے متعلق قرآن و سنت نے جو احکام دیے ہیں اور اسلامی زندگی بنانے کا ضابطہ مقرر فرمایا ہے، اسی کا نام "علم فقہ" ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ نو بہ نو، پے بہ پے مسلسل حرکت کا نام ہے اور دنیا تغیر پذیر و فنا آمیز ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسکے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں، نشوونما اور ارتقا پذیری بھی اسی تغیر و تبدل کی دین ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ یہ تغیراتی عمل، بخت و اتفاق یا ناگہانی حادثہ نہیں ہے، بلکہ ایک منظم اور اٹل قانون فطرت کی عطا ہے۔

شریعتیں زمانے کے حالات اور تقاضوں کے اعتبار سے تغیر پذیر بھی ہیں اور قابل تبدیل و تنسیخ بھی، جو شریعتیں کلیتاً موقت تھیں وہ مدت پوری ہونے کے بعد کلیتاً ختم ہوگئیں، جو احکام وقتی تھے، وقت گزرنے کے بعد وہ بھی کالعدم ہوگیے، مگر دین، مستقل اور پائیدار اصول و ضوابط کا مجموعہ ہے، اسلام دین فطرت ہے، اس کے بھی اصول ناقابل تغیر و تبدل ہیں، اسی حقیقت کو قرآن نے بایں الفاظ واضح کیا ہے: فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلاً[1] (ہرگز تم اللہ کی سنت میں تغیر و تبدل نہیں پاؤگے)

یہ دنیا کے سرد و گرم سے متاثر نہیں ہوتا، نہ اسے پگھلایا جاسکتا، نہ شیشے میں اتارا جاسکتا ہے، اسے وہ رنگ دوام حاصل ہے جس پر نہ کوئی دوسرا رنگ چڑھتا ہے،

---

[1] سورۂ فاطر آیت ۴۳

نہ امتداد زمانہ سے پھیکا پڑتا ہے۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی ضروریات میں کچھ ضرورتیں ادلتی بدلتی رہتی ہیں، ان کے لیے تغیر پذیر قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ انفرادی، اجتماعی شخصی اور عمومی دائروں میں کچھ قوانین ناقابل تبدیلی ہوتے ہیں، جو اصول ثابتہ کی حیثیت رکھتے ہیں متغیر حالات انھیں سے وابستہ ہوتے ہیں، یہ اصول ثابتہ ہر بدلی ہوئی صورت میں ضمنی قانون پیدا کرسکتے ہیں اور نئے حالات، تغیر پذیر و متبدل دنیا میں نئے سوالوں اور وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں خداوند عالم کے حقیقی اور واقعی احکام تک پہنچنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ درحقیقت انھیں سوالات کے جوابات ہیں۔

دین اسلام آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک، بلکہ قیامت تک بدون تغیر و تبدل باقی رہنے والا مذہب ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اسکے اصول ثابتہ علیٰ حالہٖ قایم و دایم رہیں گے، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہ ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے، البتہ شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں اور گنجائشیں رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں مناسب حال رہنمائی کرسکیں۔

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ جامد ذہن لکیر کا فقیر بنا ہر پرانی وضع قطع کو منجملہ دینی امور اور مذہبی شعائر جانتا ہے اور قدامت پرستی و آثار قدیمہ کی حفاظت ہی اس کا دین و مذہب ہے، مگر جدت پسند ذہن بھی فیشن کی طرح جملہ دینی امور میں آئے دن حسب دل خواہ تبدیلی چاہتا ہے، وہ دنیا میں رونما ہونیوالی ہر تبدیلی کو ترقی سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں موقف غلط ہیں۔

آجکل جدت پسندی کا فیشن اور جدت طرازی کا دور دورہ ہے، غالباً یہ "کل جدید لذیذ" (ہر جدید لذیذ ہوتا ہے) کی دین ہے، مگر جس طرح ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی، اسی طرح ہر جدید کا لذیذ ہونا بھی یقینی نہیں، کام و دہن کی لذت کے ماہرین کہتے ہیں کہ: چاول نیا نہیں، پرانا لذیذ ہوتا ہے، نیز یہ مقولہ بجائے خود مرور ایام سے پرانا ہو گیا، لیکن ان لفظوں کی شیرینی اب بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ یہی حال قدامت پرستی کا ہے، نہ کلیتاً اس کو اچھا کہا جا سکتا ہے اور نہ یکسر مذموم، اسلام دین فطرت ہے، یہ اچھائی کو پسند کرتا اور برائی کو ناپسند رکھتا ہے، اچھائی ہر جگہ اس کی نظر میں مستحسن اور برائی ہر جگہ مردود و نامقبول ہے۔ اسلام نہ ہر بات میں جدت پسند ہے اور نہ ہر معاملہ میں

قدامت نواز، آئین الٰہی، قوانین فطرت، ابدی اور ناقابل تغیر و تبدل، سدابہار ہیں، ان کی یہ قدامت نمائی کی ادا ہی اسلام کو پسند ہے، قدرت نے ان کو رنگ دوام بخشا ہے اور اسلام کے دستور اساسی میں انھیں دوامی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے برخلاف جزئیات و فرعیات میں شریعت نے موقع و محل اور مقتضائے حال کی رعایت اور مناسبت سے مفاہمت کی گنجائش رکھی ہے، اور زمانے کے تمدن و ثقافت، دنیا کے پھیلاؤ اور زندگی کی جدیدیت سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت و دلیت کی ہے۔ ہر دور میں وقت ضرورت اس نے اپنی اس صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، اب اگر کوئی اسکو نہ سمجھے یا جان بوجھ کر اس سے فایدہ نہ اٹھائے تو اس بدبختی کا کیا علاج ہے۔

مرد اور عورت

علم فقہ کا موضوع انسانی افعال ہیں، جو مرد اور عورت دونوں کو شامل ہیں۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ مرد اور عورت دو حیثیتوں کے حامل ہیں؛ نوعی اور صنفی، ان دونوں حیثیتوں کے اپنے اپنے دواعی اور عوامل ہیں، چنانچہ دونوں کے حقوق و فرائض میں ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

نوعی اعتبار سے دونوں انسان ہیں اور تمام انسانی خصوصیات و لوازم میں ایک دوسرے کے مساوی و مماثل ہیں، جبکہ ایسا ہے تو جملہ انسانی حقوق و فرائض میں بھی مرد اور عورت کا مساوی طور پر سہیم و شریک ہونا یقینی اور لازمی ہے۔

صنفی اعتبار سے مرد اور عورت ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، جس کا فطری تقاضہ اور قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کے صنفی حقوق و فرائض بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متمایز ہوں گے۔

اسے تجاہل عارفانہ کہیے یا جہل مرکب، یا تاریخ انسانیت کا المیہ کہ مرد اور عورت نہ اپنے آپ کو سمجھ سکے ہیں، نہ ایک دوسرے کا ادراک کر پائے ہیں اور جب تک دونوں کی حقیقت و نوعیت اور شخصیت و حیثیت سمجھ نہیں لی جائے گی اس وقت تک

ان کے حقوق و فرائض کی نہ صحیح تشخیص ہو سکتی ہے اور نہ صحیح تجویز و تعیین۔

فلسفۂ تخلیق و تولید و تناسل پر غور کیا جائے اور انفس و آفاق میں خداوند عالم کی قدرت و حکمت کی منظم کاریگری اور نشانیوں کو دیکھا جائے تو عجب معجز نمائیاں نظر آتی ہیں۔ مرد اور عورت کی تخلیق ایک ہی مادہ تولید سے ہے، دونوں کا قرار مکین بھی ایک ہے، بطن مادر میں پرورش کا انداز بھی ایک، مگر کچھ غیر حسی اور لاشعوری عوامل کی بدولت صورت گری کے مراحل میں لڑکے اور لڑکی کے بعض اعضا و جوارح کی جداگانہ ساخت و پرداخت، جہاں انفس و آفاق میں قدرت کی جیتی جاگتی، منہ بولتی نشانیاں ہیں، وہاں عقل و شعور کو یہ پیغام بھی دیتی ہیں کہ؛ جس طرح دونوں کا مادۂ تخلیق، رگوں میں رواں دواں خون اور بنیادی ضروریات زندگی دونوں کے ایک ہیں، اسی طرح دونوں کے بنیادی انسانی حقوق و فرائض بھی مشترک اور ایک جیسے ہیں، اور جس طرح بعض اعضا و جوارح کی صورت گری اور شکل پذیری میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح ان کے اپنے اپنے صنفی خصوصیات و عوامل اور دواعی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں

اور اسی اعتبار سے دونوں کے صنفی حقوق و فرائض بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہیں، جب تک ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا اس وقت تک دونوں کے مشترک یا مختلف تقاضوں کی تشخیص و تعیین میں غلطی ہوتی رہے گی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کائنات کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کرنے والا انسان اپنے وجود کا معمہ حل نہیں کر پایا ہے، کبھی یہ خدا بن بیٹھا اور کبھی نرا حیوان ہو گیا، اسی طرح عورت کا وجود افراط و تفریط کا محور بنتا آرہا ہے۔ معاذ اللہ کبھی یہ قدرت کی سب سے بڑی بھول قرار پائی، تو کبھی خدا کی بیٹی متصور ہوئی کبھی اسکا وجود نحوست و نکبت کی علامت بنا تو کبھی یہ مایہ کی لچھمی دیوی بنی، کبھی اس پر عرصۂ حیات تنگ ہوا، زندہ درگور کی گئی تو کبھی مرد کی تسکین نفس کا شکار ہوئی اور بازار حسن و بالاخانہ کی زینت بنی، روشنی و روشن خیالی کا دور آیا تو آزادی کے سبز باغ دکھا کر اسے پردۂ سیمیں پر اور نائٹ کلبوں، تھیٹروں، عریاں فلموں میں رقصاں کیا گیا، آج بھی دکانوں، کارخانوں

بازاروں، ہوائی سروسوں، پوسٹروں، اشتہاروں، گلی کوچوں میں مختلف انداز میں اسکی تشہیر ہو رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ عورت خوش ہو رہی ہے کہ یہ سب میری عزت افزائی کی علامت ہے۔

تاریخ انسانیت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم میں عورت کی بدنصیبی یہ تھی کہ اس کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور عصر جدید میں اسکی بدبختی یہ ہے کہ اسکا عورت ہونا فراموش کر دیا گیا، مرد نے اسکی مظلومیت پر مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے ہمدردی کا سوانگ بھرا اور اس کے دل کو موہ لیا، مرد کی چال میں آکر عورت اپنے فطری صنفی حقوق سے دست بردار ہو گئی، مرد کا جادو چل گیا، اس نے بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے اس پری پیکر کو شیشے میں اتار لیا، عورت خوش ہے کہ نگارخانۂ عالم میں مجھے حقوق انسانی کا شیش محل مل گیا اور مرد عورت کی سادہ لوحی پر زیر لب مسکرا رہا ہے، کس نے کیا کھویا اور کیا پایا، وہ ابھی تک نہ سمجھ سکی ہے اور نہ سمجھ پائے گی۔

سترہویں صدی عیسوی کے بعد مغربی دنیا میں بیداری کی لہر اٹھی، مختلف علمی فلسفی اور نظریاتی تحریکیں نمودار ہوئیں، انسان کے ناقابل سلب و انتقال فطری حقوق کا احساس جاگا اور حاکم و محکوم، امیر و غریب، کالے گورے، مرد و عورت کی آزادی اور انسانی مساوات کے

نظریے نے جنم لیا۔

انیسویں صدی نے انگڑائی لی تو حقوق انسانی کے ساتھ ساتھ کچھ اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی فکری زاویے پیدا ہوئے اور سوشلزم کا ظہور ہوا۔ بیسویں صدی نے آنکھ کھولی تو سرمایہ داروں کے مقابلے میں مزدوروں کے حقوق اور مردوں کے حقوق کے مقابلے میں عورتوں کے حقوق کا مسئلہ اٹھا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ادارہ اقوام متحدہ نے مساوات حقوق انسانی کا منشور شایع کیا۔ یہ ساری تحریکیں اور حقوق انسانی کی بحالی کی کوششیں یقیناً لائق صد تحسین و آفریں ہیں، مگر ان تمام تحریکوں اور کوششوں میں صرف نوع بشر کے حقوق کی جھلکیاں ملتی ہیں، مرد اور عورت کے دو صنفی حقوق و فرائض کی تجلیاں کہیں نہیں۔

مرد اور عورت کے متغایر دو جنسی پہلوؤں کو نظر انداز کرنیکا سبب خواہ کچھ ہو مگر اس جہل مرکب یا تجاہل عارفانہ سے جو غلط نظریے پیدا ہوئے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مرد، مرد رہا، نہ عورت عورت رہی، یہ دونوں وجود ایک دوسرے میں مدغم ہو کر تیسری صنف بن گئے۔

نکلتے اور ڈوبتے سورج کی روپہلی کرنیں جس طرح سطح آب کو دلکش و دلفریب بنا دیتی ہیں، اسی طرح آزادی اور روشن خیالی کی ترنگ نے

آدمی کو از خود وارفتہ کر دیا ہے، مگر جس طرح گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، اسی طرح روشنی کی بہتات بھی آنکھوں میں چکاچوند اور نگاہ کو خیرہ کر دیتی ہے اور پیش پا افتادہ چیز دکھائی نہیں دیتی، آزادی کی امنگ اور روشن خیالی کی ترنگ نے تہذیب جدید کے متوالوں کی گویا مت مار دی جھومتے، ڈگمگاتے چلے جا رہے ہیں، سب ہی نشہ میں چور ہیں تو کون، کس سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہیں۔

آزادی کا لفظ اتنا عام اور زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے کہ ہر شخص بلا روک ٹوک جہاں چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے لیکن کیا واقعی انسان کا کلیتاً آزاد منش اور بے مہار ہونا مہذب دنیا میں قابل قبول ہے؟

معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لیے قانون ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے، قانون ہی کے ذریعے اجتماعی شیرازہ بندی ہوتی ہے، حقوق کا تحفظ ہوتا ہے، مظالم کی روک تھام، عدل و انصاف کے قیام، بین الاقوامی ربط و ضبط، سب میں قانون کی عملداری ہے، اس کا بنیادی مقصد منفعت پہنچانا اور نقصان و ضرر کو دور کرنا ہے، جو قانون جتنا معاشرے کی خدمت اور سعادت کا حامل ہوتا ہے اتنا ہی کامیاب و کامران ہوتا ہے اور جو قانون اس مقصد و مآل کو

حاصل کرنے میں ممد و معاون نہ ہو وہ باطل و نامقبول ہوتا ہے۔

انسان خواہشوں کا پتلا اور نفس امارہ کا بندہ ہے، اس سے فرائض میں کوتاہی، اوروں کے حقوق کی پامالی کا اندیشہ نہ ہوتا تو قانون کی ضرورت پیش نہ آتی، طرح طرح کی آرزوئیں دل میں مچلتی ہیں اور نفس امارہ قانون شکنی پر اکساتا ہے، ہفت اقلیم کی حکومت اور دنیا جہان کی دولت پالینے کے بعد بھی انسان بس نہیں کرتا، هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا سلسلہ قایم رہتا ہے اور یوں دوسروں کے حقوق کے استحصال، مقابلہ و مقاتلہ اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہو جاتا ہے، اس کی روک تھام ضروری ہے، لیکن جس قانون میں عظمت و تقدس اور احترام نہ ہو وہ طاقت کے بل بوتے پر محض ذہنوں پر مسلط ہو سکتا ہے، دلوں پر اس کی حکمرانی نہیں ہوتی اور چوری چھپے، آنکھ بچا کر قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے، البتہ جو قانون عظمت و حرمت کا حامل ہوتا ہے وہ عقیدہ بن کر دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے اور اسکا تقدس و احترام رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔

قانون وہی کامیاب و کامران اور قابل قبول ہوتا ہے جو حق و انصاف پر مبنی، فطری حقوق کا آئینہ دار و علمبردار نیز مرد و عورت کی فطری قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق ان کے حقوق و فرائض متعین کرنے کی اپنے اندر صلاحیت و اہلیت

رکھتا ہو، اس لیے مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کی تجویز و تعیین سے پہلے ان دونوں کی خداداد فطری قوتوں اور صلاحیتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

کائنات کا ذرّہ ذرّہ قادر مطلق کی قدرت و حکمت کا نمونہ ہے، مخلوقات کا مختلف نوعوں، علیحدہ علیحدہ جنسوں اور گروہوں میں تقسیم ہونا، ان کے جداگانہ خصوصیات کا متقاضی ہے اور جداگانہ خصوصیات سے ان کے جداگانہ فرائض و وظائف کی نشان دہی ہوتی ہے۔

حیوانات کو دیکھیے! اونٹ کو ریگستان کا جہاز بنایا تو ریگستانی علاقے کی مناسبت سے پاؤں عطا ہوئے بلکہ ہفتہ بھر کا پانی اسٹاک کرنے کی تھیلی بھی عنایت ہوئی۔ اونٹ، بکری کی غذا جنگل کی خاردار گھاس، پتے، پیڑ، پودے ہیں تو ویسے ہی زبان اور دانت بخشے گئے، شیر کی غذا زندہ جانور کا گوشت ہے، اس لیے اس کے پنجے نہایت تیز، سخت، نکیلے اور خاردار بنائے گئے۔ اسی طرح نر اور مادہ کے امتیازی اعضا و جوارح کی جداگانہ تشکیل ان کے جداگانہ مقتضیات کی آئینہ دار ہے نیز یہ بات بھی ناقابل فراموش ہے کہ یہ فرق صرف مختلف الصورت اعضا و جوارح تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہمشکل اور متحد العمل چیزوں میں بھی کارفرما ہے، چنانچہ چند بنیادی مشترک چیزوں پر تجزیاتی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

وزن : مرد کا وزن، عورت کے وزن سے اوسطاً پانچ کلو زیادہ ہوتا ہے، وزن کا یہ فرق خاص طور پر ہڈیوں کے ڈھانچے میں نمایاں ہوتا ہے، عورت کا ڈھانچہ، مرد کے ڈھانچے سے ہلکا ہوتا ہے، عورت کی ہڈیاں ایک طرف تو حجم اور مضبوطی میں مرد کی ہڈیوں سے کم ہوتی ہیں، دوسری طرف ان کی نوکیں (جو عضلات کا مرکز ہیں) بہت کم نمایاں ہوتی ہیں، اسکے علاوہ اس کے ڈھانچے میں انتقال اور حرکت کی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔[1]

عضلات : مرد کے عضلات سے عورت کے عضلات ضعیف، حجم میں تقریباً تہائی کم اور چستی و چالاکی میں اس سے بہت کم درجہ کے ہوتے ہیں، ان ہی کی وجہ سے عورت بہ نسبت مرد کے بطی الحرکت ہوتی ہے اور انہی کی وجہ سے اس میں ضبط کی قابلیت کم ہوتی ہے، البتہ وہ نظام عصبی جس پر عورت کی شکل و صورت کی گولائی، اس کے جسم کی لچک کا دار و مدار ہے، اس میں عورت کو ترجیح حاصل ہے۔

دل : عورت کا دل، مرد کے دل سے بہت چھوٹا اور ہلکا ہوتا، عورت کا دل ۲۴۰ کلوگرام اور مرد کا ۳۰۰ کلوگرام کا ہوتا ہے۔

---

[1] تشریح و منافع الاعضاء، کتاب مخزن حکمت
ج : ۱

نبض: مرد کی نبض سے عورت کی نبض زیادہ تیز، اسکی رفتار مرد کی نبض کی رفتار سے بہت زیادہ ہوتی ہے، مرد کی نبض ایک سکنڈ میں دس بار اور عورت کی چودہ بار چلتی ہے۔ [۱]

خون: مرد کے خون سے عورت کے خون کی مقدار اور ترکیب مختلف ہوتی ہے، عورت کے خون کی مقدار مرد سے کم ہوتی ہے، اس کے خون میں نمکین اجزا اور ہیموگلوبین کم ہوتے ہیں، عورت میں سرخ خون اور مرد میں سفید خون کے اجزا کی کثرت ہوتی ہے۔ [۱]

دماغ: مرد اور عورت کی کھوپڑی میں ۱۰۰ اور ۸۵ کی نسبت پائی جاتی ہے، مغز کا حجم بھی بالعموم کھوپڑی کے حجم کے برابر ہوتا ہے، مرد کے مغز سے عورت کا مغز چھوٹا اور ہلکا ہوتا ہے، عورت کی کھوپڑی کا وزن ۱۱۰۰ سے ۱۳۰۰ کلوگرام تک کا، اور مرد کی کھوپڑی کا وزن ۱۲۰۰ سے ۱۴۰۰ کلوگرام کا ہوتا ہے مغز کی شکل اور اس کے پیچ وخم میں بھی اسی قسم کا فرق ہے، عورت کے سر کے بھیجے میں پیچ وخم نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام بھی نامکمل ہے، سائیکلوجی کے ماہرین نے اس اختلاف کو ان دونوں جنسوں کے ممیزات میں ایک اہم ممیز قرار دیا ہے، اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے، جوہر سنجابی ہی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے، اس لیے یہ اختلاف بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ [۱]

---

[۱] التوضیح فی اصول التشریح ص: ۴۲۲۔ تشریح ومنافع الاعضا کتاب مخزن حکمت ج: ۱

تنفّس : مرد سے عورت کے سینے اور پھیپھڑے کی وسعت بہت کم ہوتی ہے، اگرچہ بہ نسبت مرد کے عورت سانس تیز لیتی ہے، لیکن کیمیاوی حیثیت سے اسکا درجہ بہت کم ہوتا ہے، کیونکہ مرد سانس لینے میں عورت کے مقابلے میں زیادہ آکسیجن جذب کرتا اور زیادہ کاربونک خارج کرتا ہے۔ ؎

اعضایے رئیسہ کے علاوہ حواس خمسہ جن پر انسان کی عقلی اور دماغی نشوونما کا مدار ہے، ان کے اعتبار سے بھی عورت اور مرد میں نمایاں فرق ملتا ہے۔

ا۔ عورت کی قوت شامہ جتنے فاصلے سے لیمو کی خوشبو محسوس کرسکتی ہے، مرد کی قوت شامہ اسکے دوگنے فاصلے سے محسوس کرسکتی ہے، نیز مخصوص فاصلہ سے جس مقدار کی خوشبو مرد آسانی سے محسوس کرلیتا ہے، عورت اتنے فاصلے سے تب محسوس کرسکتی ہے جب خوشبو کی مقدار اس سے دوگنا زیادہ ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہلکے براسک ایسڈ کی بو عورت $\frac{1}{20,000}$ کی نسبت سے اور مرد $\frac{1}{10,000}$ سے محسوس کرسکتا ہے۔ ؎

ب۔ مرد کی قوت ذائقہ وسماعت بھی عورت سے بہت زیادہ قوی ہے، یہی وجہ ہے کہ کھانے کے خوش ذائقہ یا بدمزہ ہونیکی پرکھ کرنیوالے،

؎ التوضیح فی اصول التشریح ص: ۴۲۲

آواز کی جانچ کرنیوالے اور راگوں کے نقاد کل کے کل مرد ہیں ۔ [1]

مرد اور عورت کے اعضا و جوارح کی ساخت اور دیگر بنیادی چیزوں میں یہ اختلاف بلا وجہ نہیں، بلکہ جس صنف کا جو فطری و طبیعی کام ہے اسی کے مطابق جسم کی تشکیل ہوئی اور اسی لحاظ سے صلاحیتیں ودیعت ہوئیں ۔

قدرت نے دنیا کے کاموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے : افزائش نسل اسکی نگہداشت اور انسانی ضروریات کی فراہمی ۔ پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا گیا ہے چنانچہ اسے اسی قسم کے اعضا اور اسی قسم کی جسمانی قوت دی گئی جو اس فرض کی انجام دہی کیلیے ضروری ہے ۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا گیا اسی لیے مرد کو جسمانی اور دماغی طاقت اسکے مطابق عطا ہوئی، لہذا ان دونوں گروہوں کو اپنے اپنے حدود اور دائرے میں رہتے ہوئے اپنے اپنے طبیعی فرائض کو انجام دینا ہی تقاضایے فطرت ہے، جس طرح مردوں کیلیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ عورت کے فطری فرائض میں حصہ لیں، اسی طرح عورت اس بات پر قادر نہیں کہ وہ مردوں کے کام انجام دے سکے ۔

افزائش نسل اور اسکی حفاظت و پرورش کا کام عورت سے متعلق ہے اس کے چار مراحل ہیں : حمل ، ولادت ، رضاعت ، تربیت ۔

---

[1] التوضیح فی اصول التشریح ۔

حمل : ان میں سے ہر ایک مرحلہ عورت کے لیے بڑی نزاکتوں کا حامل ہے، بالخصوص ابتدائی تین مرحلوں میں عورت زندگی کی دوڑ میں ہرگز مرد کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتی، حمل کے زمانہ میں عورت کو پھونک پھونک کے قدم رکھنے ہوتے ہیں، اسکی معمولی سے معمولی حرکت کا اثر تنہا اسکی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اسکے شکم میں موجود بچہ پر بھی اسکا اثر پڑتا ہے، ماں کے حرکات وسکنات ہی نہیں، بلکہ اسکے خیالات و تصورات تک بچے کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں[۵]، نو مہینے کی مدت میں جنین مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور ہر ایک مرحلے میں عورت کو اپنے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں بڑی احتیاط برتنا پڑتی ہے، اس لیے کہ اسکی ادنیٰ سی لاپروائی اسکے اور جنین کے لیے موت کا پیغام بن جاتی ہے، تو پھر وہ مرد کے دوش بدوش رہ کر عصر حاضر کے تقاضوں کو کیوں کر پورا کرسکتی اور محنت مشقت کے کام انجام دے سکتی ہے۔

ولادت : یہ مرحلہ عورت کے لیے بڑا سخت ہوتا ہے، یہ وقت زندگی اور موت کی کشمکش سے کم نہیں، اس میں عورت زندگی سے دور اور موت سے قریب ہوجاتی ہے اور وضع حمل کے بعد اسے گویا دوبارہ زندگی ملتی ہے، صحت وقوت کی بحالی کے لیے اسے دوا و غذا اور آرام کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی بتایے کہ وہ اس زمانے میں زندگی کی دوڑ میں کیسے حصہ لے سکتی، اپنی روزی آپ کما سکتی اور میدان عمل میں ہمہ جہتی مساوات کا مظاہرہ

---

۵ حفظ صحت حاملہ مخزن حکمت ص: ۲۱۴۹، ۲۱۵۰، ج ۲

کر سکتی ہے۔؟

رضاعت : ماں کے لیے یہ مرحلہ اتنا اہم نہیں جتنے پہلے دو مرحلے، لیکن بچہ کے لیے یہ زمانہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس لیے کہ جو بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے، اصول حفظان صحت کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک اسکی تندرستی و بیماری میں دودھ کی تاثیر شامل حال ہوتی ہے، اگر ماں نامناسب یا غیر معتدل غذا اور فاسد و مولد امراض چیزیں استعمال کرتی تو اسکا مضر اثر دودھ کے ذریعے بچے پر پڑنا یقینی ہے، اسی طرح ماں کا میلا کچیلا اور گندہ رہنا بھی بچے کے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے، لہذا ماں کا ہر وقت صاف ستھرا اور ہشاش بشاش رہنا اور ساتھ ہی ساتھ بچے کی صفائی ستھرائی کا پورا پورا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔[۵]

یہ صحیح ہے کہ عصر حاضر نے شیر خوار بچوں کے لیے ڈبے کا دودھ ایجاد کر کے نہ صرف ماؤں کے پستان کی قدرتی خوبصورتی اور سختی کے علی حالہ دیر تک قایم رہنے کا سامان فراہم کر دیا، بلکہ ماں کے فاسد دودھ سے بے نیاز اور محفوظ رہنے کے امکانات بھی پیدا کر دیے، لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ماں کے صالح دودھ کا اسے نعم البدل یا بدل قطعی طور پر قرار نہیں دیا جا سکتا، نیز ماں کے صالح دودھ میں قدرت نے جو اخلاقی تاثیر ودیعت کی ہے اوپری دودھ میں

---

۵ مخزن حکمت ص: ۲۱۹۲

وہ ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔

تربیت: بچہ کی ذہنی ساخت و پرداخت اور مستقبل سازی کا دارومدار تربیت پر ہوتا ہے، بنیاد کی پہلی اینٹ پر عمارت کی کجی اور استواری موقوف ہوتی ہے، بچے کی آئندہ زندگی کا خاکہ ابتدائی تربیت کے مطابق تشکیل پاتا ہے، بچے کا ذہن ایک حساس خودکار (آٹومیٹک) کیمرے کے مانند ہوتا ہے، اس کے سامنے جو چیز جس انداز میں آتی ہے، ویسا ہی عکس ذہنی ریل پر مرتسم ہوتا رہتا ہے، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سابقہ بچہ کو ماں سے پڑتا ہے، اگر بہت سی باتیں ماں کے دودھ کی تاثیر بن کر بچے کی جزو طینت قرار پاتی ہیں تو بہت سی چیزیں ماں کی تعلیم و تربیت ودلیعت کرتی ہے۔

جس طرح حالت حمل میں ماں کے افکار و خیالات، خوش مزاجی، پراگندہ خیالی، خوشی و خرمی یا مصائب و آلام کے حالات و کیفیات سے جنین متاثر ہوتا اسی طرح رضاعت کے زمانے میں ماں کے دودھ سے پرورش پانے والا شیرخوار بھی متاثر ہوتا ہے اور خارجی طور پر ماں کے حرکات و سکنات اور حالات و کیفیات سے اس کا مزاج تشکیل پاتا رہتا ہے[1]، اس اعتبار سے ماں کا ہر ہر لمحہ

---

[1] مخزن حکمت ص: ۲۱۹۲
ج ۲

کردار ساز ہوتا ہے اور اسے ہر لحظہ محتاط رہنا ضروری ہے۔[۱]

مذکورۂ صدر چار ادوار کی نوعیت پیش نظر رکھتے ہوئے ارباب دانش غور فرمائیں کہ کارگاہ حیات میں سیاسی، سماجی، اقتصادی طور پر مرد و عورت کی ذمہ داریاں جملہ جہات سے متساوی مان لی جائیں جیسا کہ عصر حاضر کا تقاضہ ہے تو کیا واقعی عورت کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ہر حال میں مرد کے قدم بقدم چل سکے؟ نہیں ہرگز نہیں!

سب ہی جانتے ہیں کہ زچگی کے زمانے میں عورت کے تمام قوی حد درجہ مضمحل ہو جاتے ہیں، اس کے لیے محنت و مشقت کے کام کرنا تو درکنار ہلکے پھلکے کام کرنا بھی مضر ہوتا ہے صحت کی بحالی کے لیے اسے مکمل آرام کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے عالم میں وہ مرد کے تعاون کی محتاج ہوتی ہے، مگر شاید تہذیب جدید کے متوالے مرد و عورت کی ہمہ جہتی مساوات کے نظریے کے تحت عورت کو خود کفیل اور خود مختار قرار دیتے ہوئے (Help yourself) "اپنی مدد آپ کرو" کی تلقین کریں گے، جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے بیوی کے نان و نفقہ اور بچے کی کفالت کی ذمہ داری مرد پر عاید ہے، انسانی ہمدردی بھی یہی ہے۔ وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف[۲] (بچہ جس کا ہے (یعنی باپ) اس پر دودھ پلانے والی کا کھانا، کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے)

---

[۱] کتاب مخزن حکمت ص: ۲۱۹۲ [۲] سورۃ البقرۃ: آیت ۲۳۳

عصر جدید کی روشنی میں اگر عورت کی زندگی کا ماں، بیوی اور بیٹی کے روپ میں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جن ممالک میں مائیں بچہ جننے کی ایک مشین کا کام انجام دیے کر بچے کو سرکاری یا مشنری پرورشگاہ کے حوالے کر دیتی ہیں، وہاں جس طرح بچوں کو ماں باپ کی شفقت و محبت نصیب نہیں ہوتی، اسی طرح ماں باپ کو ان سے خدمت گزاری اور عزت و احترام کا حق حاصل نہیں ہو پاتا۔ مشنری و سرکاری پرورش و تربیت گاہیں بچوں کے ساتھ خواہ حفظان صحت کے اصولوں اور نفسیاتی پہلوؤں کے مطابق کتنا ہی عمدہ رویہ اختیار کریں مگر پھر بھی وہ ماں باپ کی فطری خصوصی محبت کا قائمقام نہیں ہو سکتا اور چونکہ یہ بچے ماں باپ کی محبت، آغوش تربیت، دست شفقت اور سایۂ عاطفت و رحمت سے آشنا نہیں ہوتے لہذا ماں باپ کی اطاعت شعاری، خدمت گزاری اور خبر گیری کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

دنیا کے کسی صحیفۂ اخلاق و تعلیمات میں والدین کے ساتھ اس حسن سلوک، فروتنی و انکساری اور عزت و توقیر کی تعلیم نہیں ملتی جو اسلام نے دی ہے، چنانچہ چند اسلامی تعلیمات و ہدایات ہدیۂ ناظرین ہیں:

وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلھما	اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ سے نیکی کرنا، اگر انمیں سے ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو

فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما
وقل لهما قولاً كريماً ۔
واخفض لهما جناح الذل
من الرحمة وقل رب ارحمهما
كما ربيانى صغيراً [1]

ان کے جواب میں اُف تک نہ کہنا اور نہ جھڑکنا
اور (جو کچھ کہنا سننا ہو) تو بہت ادب سے کہا کرو
اور انکے سامنے نیاز سے خاکساری کا پہلو جھکائے رکھو
اور (انکے حق میں) دعا کرو کہ اے میرے پالنے والے
جس طرح ان دونوں نے میرے بچپنے میں میری پرورش
کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما ۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے :

ووصينا الانسان بوالديه
حملته امه وهناً على وهن
وفصاله فى عامين ان اشكرلى
ولوالديك الى المصير
وان جاهدك على ان
تشرك بى ما ليس لك به
علم فلا تطعهما فى الدنيا
معروفاً [2]

اور ہم نے انسان کو جسے اسکی ماں نے
دکھ پر دکھ سہ کر پیٹ میں رکھا اور دو برس میں
اسکی دودھ بڑھائی کی (اپنے اور) اسکے ماں باپ کے
بارے میں تاکید کی کہ میرا بھی شکر یہ ادا کرو اپنے والدین کا
(بھی اور آخر سبکو) میری طرف لوٹ کر جانا ہے اور
اگر تیرے ماں باپ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو میرا
شریک ایسی چیز کو قرار دے جسکا تجھے کچھ علم بھی نہیں
تو تو (اسمیں) انکی اطاعت نہ کر (مگر تکلیف نہ پہنچا) اور
دنیا کے کاموں میں انکا اچھی طرح ساتھ دے ۔

مذکورہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانی شعور کو بیدار کیا ہے اور محسن کے حق میں جذبۂ شکر گزاری کی تلقین کی ہے ، والدین کے لیے شکر گزاری کو اپنے شکر کے ساتھ

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۴ [2] سورۂ لقمٰن آیت ۱۵

وابستہ کیا ہے ، ماں باپ کی عنایتوں اور ماں کی مشفقتوں مصیبتوں کو یاد دلا کر جذبۂ احسان مندی کو ابھارا ہے اور بتایا کہ جو والدین کا شکر گزار نہیں وہ گویا اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہے۔ ماں باپ کے حق میں رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

قال رسول اللہؐ رقودک علی السریر الی جنب والدیک فی برّھما افضل من جھادک بالسیف فی سبیل اللہ۔ [1]

تیرا ماں باپ کے پہلو میں تخت پر پڑے پڑے انکی بھلائی میں جاگتے رہنا راہ خدا میں تلوار سے جہاد کرنے سے بہتر ہے۔

دوسری حدیث ہے:

قال رسول اللہؐ یا علیؑ رضی اللہ کلمۃ فی رضاء الوالدین ولیسخط اللہ لسخطھما [2]

جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے: اے علیؑ! ماں باپ کی خوشنودیٔ مزاج میں ایک جملہ کہنے سے اللہ راضی ہو جاتا اور ان کے غضب ناک ہونے سے اللہ غضب ناک ہوتا ہے۔

ماں کے علاوہ عورت کی ایک حیثیت بیوی ہونا ہے، اس سلسلہ میں قرآن انسانی نقطۂ نظر سے مرد اور عورت کی کلی مساوات کا

---

[1] فصل فی بر الوالدین (جامع الاخبار) [2] فصل فی بر الوالدین (جامع الاخبار)

اعلان کرتا ہے اور بتاتا ہے :

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء ۔ [1]	اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور (وہ اسطرح کہ پہلے) ان (کی باقی مٹی) سے انکی بی بی (حوا) کو پیدا کیا اور انھیں دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ تمام انسانوں کی تخلیق ایک ہی نفس سے ہوئی ہے، اس اعتبار سے تمام مرد عورتیں بلا امتیاز رنگ ونسل اور خون وقومیت کے آپس میں مساوی ہیں، مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی، کوئی کسی سے کمتر ہے نہ برتر، سب کے سب انسان ہیں اور انسانی حقوق کے یکساں طور پر حقدار ہیں، میاں بیوی ہونے کے ناتے مرد عورت کا جوڑا ہے تو عورت مرد کی، ھن لباس لکم وانتم لباس لھن ۔ [2]

(وہ تمہارے لیے بمنزل لباس کے ہیں اور تم ان کے لیے)

اس آیت میں عورت ومرد کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیکر چند لطیف پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے :

---

[1] سورۃ النساء آیت ۱۔ [2] سورۃ البقرہ آیت ۱۸۷

لباس ساتر جسم ہوتا ہے، اس سے بدن کے ظاہری عیوب و نقائص چھپ جاتے ہیں نیز گرد و غبار، موسم کی گرمی و سردی کے اثرات سے بدن محفوظ رہتا ہے، اسی طرح گویا مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو ازدواجی تعلقات قایم کر کے جنسی برائیوں، بے اعتدالیوں اور گمراہیوں سے بچاتی ہیں۔ لباس انسان کے لیے باعث زیبائش و آرائش بھی ہوتا ہے، اس اعتبار سے مرد عورتوں کے لیے اور عورتیں مردوں کیلیے زیب و زینت کا سبب ہیں۔

صنف نازک کی ایک صورت لڑکی، بیٹی ہونا ہے:

رومیوں کے یہاں بیٹی کو مالکانہ حق حاصل نہ تھا، جسٹی نین کے عہد میں یہ قانون بنا کہ عورت اپنی ذاتی کمائی کی مالک ہو سکتی ہے، غلاموں، چھوٹے بچوں کے ساتھ ساتھ باپ یا شوہر ان کے مالک ہوتے تھے، کوئی شخص کسی کی لڑکی کو قتل کر دیتا تو قصاص میں اپنی گردن زدنی کرانے کے بجایے اپنی بیٹی دے دیتا تھا، جسے مقتول کا باپ قتل کر ڈالتا یا معاف کر دیتا، دختر کشی کی رسم صرف عرب تک محدود نہ تھی

بلکہ ہندوستان میں بھی خاصا رواج تھا۔ [1]

اسلام وہ منفرد مذہب ہے جس نے عورت کو نہ صرف جینے کا حق دیا بلکہ اشرف مخلوقات کی مسند پر مرد کے پہلو میں جگہ دی اور عزت و حرمت کا مستحق بنایا، اسے میراث و ملکیت کا حق بخشا، بیٹے کو نعمت الٰہی بتایا تو بیٹی کو رحمت پروردگار سے تعبیر کیا۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ عورت کے ساتھ مرد کے جتنے رشتے ہو سکتے ہیں اسلام نے سب میں عظمت و محبت کی شان پیدا کر دی۔

عورت کے بارے میں تاریخ انسانیت کا اسلام سے پہلے، اسلام کے بعد اور عہد حاضر میں مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے پہلے کے مذاہب و تہذیب میں عورت کے ساتھ تفریط اور حق تلفی کا رویہ اختیار کیا گیا، یونان میں عورت کو شیطان کی بیٹی اور نجاست کا مجسمہ سمجھا جاتا تھا، وہ غلاموں کی طرح بازاروں میں بیچی جاتی تھی، میراث میں اسکا کوئی حق نہ تھا، نکاح اور طلاق کا معاملہ کلیتاً مردوں کے ہاتھ میں رہتا تھا، شوہر کے مال میں بیوی کو تصرف کا کوئی حق نہ تھا۔ حمورابی کے قانون میں عورت جانوروں کی طرح بے زبان ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ [2]

---

[1] اسلام اور مذاہب عالم (مظہر الدین صدیقی) ص: ۲۴۳، ۲۴۴

[2] المرأۃ فی القرآن (العقاد) ص: ۵۲

عورتوں کو تنگ کمروں میں رکھا جاتا تھا، وہ علم وفن سے محروم رہتی تھیں، شریف عورتوں کا معاشرہ میں کوئی مقام نہ تھا، عورت کا جاگیر و میراث میں کوئی حق و حصہ نہ تھا، نکاح کو عورت کے خریدنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا[1]، عرب میں زمانۂ جاہلیت میں لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی تھیں، باپ کی عورتوں کو بیٹے اپنے نکاح میں لا سکتے تھے، عصمت فروش عورتیں اپنے گھروں پر جھنڈے لہراتی تھیں، شعر و شاعری میں عورتوں کے حسن و جمال اور ان سے محبت و وصال کا کھلم کھلا اظہار ہوتا تھا۔ ایران میں مرد ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی گرفت سے بالکل آزاد تھا، اسکی مرضی اپنا آپ قانون تھی، وہ خون کے قریب ترین رشتوں میں شادی کر سکتا تھا، عورتوں کو مردوں سے علیحدہ رکھنے کی رسم صرف ایرانیوں تک محدود نہ تھی، آیونی یونانیوں (IONIAN GREEKS) میں عورتوں کو گھروں میں مقفل رکھا جاتا تھا۔[2]

مذکورہ بالا حالات و واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے پہلے مذہبی اور سماجی طور پر عورت کس قدر ذلیل و حقیر تھی اور اسلام نے آکر اسکی زندگی میں انقلاب پیدا کیا اور معاشرہ میں اسے عزت و وقار کا مقام بخشا۔

عصر حاضر نے حقوق انسانی کے شور و غوغا میں آزادی نسواں کا خلعت پہنا کر عورت کو جس روپ میں پیش کیا ہے اسپر بھی تجزیاتی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

---

[1] المرأۃ للسباعی۔ ص: ۱۷

[2] اسلام اور مذاہب عالم (مظہر الدین صدیقی) ص: ۲۴۴

عائلی زندگی

دنیا کی کوئی بھی چیز عبث اور بیکار پیدا نہیں ہوئی ہے۔ انسانی وجود تنہا مرد یا صرف عورت کی شکل میں کافی ہوتا تو دونوں کو پیدا نہ کیا جاتا، دونوں کا وجود بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔

جسم کا کوئی عضو پورے بدن کے لیے درکار تمام امور انجام نہیں دے سکتا بلکہ خود اپنے ضروریات بھی تن تنہا پورے نہیں کر سکتا، یہی حال فرد اور معاشرے کا ہے۔ ضروریات زندگی کا یہی وہ تقاضہ تھا جو انسان کو گوشۂ تنہائی سے باہر لایا اور مل کر زندگی بسر کرنے کا داعی ہوا، اسی حسن طلب نے مرد عورت کو گدگدایا اور کارگاہ حیات میں ایک دوسرے کا شریک حیات بنایا، اسی نے توالد و تناسل پر اکسایا اور بقائے نسل کا سلسلہ چلایا، اسی سے عائلی زندگی کی داغ بیل پڑی اور خاندان و معاشرہ کی تشکیل ہوئی۔

یہ فعل و انفعال اور جذب و انجذاب کی کیفیت صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر شے میں کارفرما ہے، قدرت نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں چنانچہ قرآنی ارشاد ہے:

ومن کل شیٔ خلقنا زوجین | اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے

لعلکم تذکرون ۝[1]	تاکہ تم غور کرو۔
سبحٰن الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ۝[2]	پاکیزہ ہے وہ ذات جس نے زمین سے اگنے والی تمام چیزوں میں اور ان مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں، جوڑے بنائے۔
وجعل لکم من انفسکم ازواجاً ومن الانعام ازواجاً[3]	اس (اللہ) نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں بھی جوڑے بنائے۔

بقائے وجود، تولید مثل اور افزائش نسل کا سلسلہ نباتات و حیوانات میں موجود ہونا بدیہی بات ہے۔ ڈارون کے نظریے کے مطابق انسان عقل و شعور کے علاوہ بقیہ کل کا کل، پورے کا پورا حیوان ہے، تو پھر انسان کا افزائش نسل کے حیوانی فریضہ سے کنارہ کش ہونا چہ معنی دارد؟ ہاں بودھ بھکشو جیسے منی نجات کے لیے علائق زندگی سے کنارہ کشی ضروری سمجھتے ہیں، عیسائی روحانیین کے نزدیک بھی ازواجی تعلقات قائم کرنا مرد اور عورت کے لیے ایک قسم کی پلیدگی ہے، وہ حضرت مریمؑ اور جناب عیسیٰؑ کی طرح تجرد کی زندگی بسر کرنا واجب عینی تصور کرتے ہیں

---

[1] سورۃ الذاریات آیت ۴۹ [2] سورہ یٰسین آیت ۳۶

[3] سورۃ الشوریٰ آیت ۱۱

یہ نہیں سوچتے کہ جنسی انارکی کو روکنے کے لیے وہ محض ایک اصلاحی و وقتی اقدام تھا نہ کہ عمومی پیغام، بتلانا یہ تھا کہ اگر انسان چاہے تو مکمل طور پر اپنے جذبات پر کنٹرول کر سکتا ہے، چہ جائیکہ اعتدال قایم کرنا، "روحانیین" نے اسے عمومی اور دائمی حکم سمجھ لیا جس کے ردعمل کے طور پر "لذتیت" (EPICURENSM) اور "لبرلزم" (وسیع المشربی) LIBERALISM وغیرہ نے جنم لیا۔

اسلام نہ رہبانیت کو پسند کرتا ہے، نہ جنسی انارکی اور راحت پسندی کی تائید کرتا ہے۔ اسلام انسان کو انسان جانتا اور مانتا ہے، نہ نفسانی خواہشوں سے مبرا ملک فرشتہ سمجھتا ہے اور نہ عقل سے عاری حیوان مطلق، اسکے نزدیک نفس کی تسکین اور خواہشوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ عقل کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے، اس لیے کہ سائنسی نقطۂ نظر سے بھی انسان عقل و شعور کے علاوہ بقیہ حصہ حیوان ہے، تو جب بقدر حیوان حیوانی تقاضوں کا بروئے کار لانا تقاضۂ فطرت ہے، تو پھر عقل و شعور کے بقدر انسانی و عقلی تقاضوں کا ظہور پذیر نہ ہونا خلاف عقل و شعور کیوں نہ ہوگا؟

اسلام محض پوجا پاٹ کا مذہب نہیں، بلکہ عقل و شعور اور عرفان و آگہی کے ساتھ دینی اور دنیاوی تقاضوں کو بروئے کار لانے کی دعوت دیتا ہے۔

چنانچہ مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات جو اوروں کے نزدیک گندگی و پلیدگی کی علامت ہیں، اسلام انھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، نوجوانوں کو شادی کی ترغیب دیتا، ان کی عبادت کو ثواب کثیر کا حامل قرار دیتا اور شادی کو فراخیٔ رزق کا ذریعہ بتاتا ہے، چنانچہ احادیث میں وارد ہوا ہے:

قال ابو عبد اللہؑ رکعتان یصلیھما المتزوج افضل من سبعین رکعۃ یصلیھما اعزب

حضرت ابو عبد اللہؑ نے فرمایا کہ دو رکعتیں شادی شدہ کی، مجرد کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے:

قال النبیؐ رکعتان یصلیھما متزوج افضل من رجل عزب یقوم لیلہ ویصوم نھارہ۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: کہ شادی شدہ شخص کی دو رکعت نماز، مجرد کی رات بھر کی عبادت گزاری اور تمام دن کی روزہ داری سے افضل ہے۔

تیسری حدیث:

عن ابی عبد اللہؑ قال قال رسول اللہؐ رذال موتاکم العزّاب

حضرت ابو عبد اللہؑ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہؐ نے فرمایا: سب سے زیادہ ذلت کی موت بے شادی شدہ کی موت ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عن ابی عبد اللہؑ قال جاء رجل الی النبیؐ فشکا الیہ الحاجۃ فقال لہ تزوج فتزوج فوسع علیہ۔

حضرت ابو عبد اللہؑ کا ارشاد ہے کہ: نبی کریمؐ کی خدمت میں آکر ایک شخص نے اپنے ضرورت مند ہونے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا "شادی کرلو" اس نے شادی کرلی، پس اس پر رزق کشادہ ہوگیا۔

ایسی ہی ایک اور حدیث یہ ہے :

عن ابی عبداللہؑ قال اتی رسول اللہؐ شاب من انصار فشکا الیہ الحاجۃ فقال تزوج، فقال الشاب انی لا استحی ان اعود الی رسول اللہ فلحقہ رجل من انصار فقال ان لی بنتا وسیمۃ فزوجھا ایاہ۔ قال فوسع اللہ علیہ فاتی الشاب النبیؐ فاخبرہ۔ فقال رسول اللہ : یا معشر الشباب علیکم بالباہ۔[1]

حضرت ابوعبداللہؑ سے مروی ہے کہ :

"رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک انصاری جوان نے آکر اپنی حاجت بیان کی، آپ نے فرمایا، شادی کرلو، جوان کا کہنا ہے کہ مجھے رسول اللہؐ کی خدمت میں پلٹ کر جانے میں شرم محسوس ہوئی، راستے میں ایک انصار سے ملاقات ہوئی، اس نے کہا، میری خوبصورت بیٹی ہے اس سے شادی کرلو، اسکا کہنا ہے کہ شادی کے بعد خدا نے اسکے رزق میں وسعت و فراخی بخشدی جوان نے رسول اللہؐ کو اسکی خوشخبری سنائی، رسول اللہؐ نے یہ سنکر جوانوں سے فرمایا کہ "اے گروہ جوانان تم پر شادی بیاہ کرنا لازم ہے۔

قول معصوم اس حکم قرآنی کی تفسیر ہے :

وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء یغنھم اللہ من فضلہ واللہ واسع علیم۔[2]

اور اپنی (قوم کی) بے شوہر عورتوں، اپنے نوکر غلاموں اور لونڈیوں کا بھی نکاح کردیا کرو، اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے تو خدا اپنے فضل (وکرم) سے انھیں مالدار بنادیگا اور اللہ بڑی گنجائش والا واقف کار ہے۔

---

[1] کتاب النکاح وسائل الشیعۃ [2] سورۃ النور آیت ۳۲

حدیث رسولؐ ہے :

قال رسول اللہؐ من تزوج فقد احرز نصف دینہ فلیتق اللہ فی النصف الباقی [1]

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے :
جس شخص نے شادی کرلی، اس نے اپنے آدھے دین کو تو محفوظ کرلیا، بقیہ نصف میں اللہ سے ڈرتا رہے۔

دوسری حدیث :

النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی [2]

نکاح میری سنت ہے، پس جس نے میری سنت سے روگردانی کی، وہ مجھ سے سروکار نہیں رکھتا۔

وقال علیہ السلام لرجل اسمہ عکاف، ألک زوجۃ ؟ قال، لا یا رسول اللہؐ. قال ألک جاریۃ ؟ قال. لا یا رسول اللہؐ قال صلی اللہ علیہ وآلہ، افانت موسر ؟ قال، نعم. قال، تزوج والا فانت من المذنبین. وفی روایۃ والا فانت من اخوان الشیاطین [3]

رسول اکرمؐ نے عکاف سے دریافت فرمایا :
آیا تمہاری بیوی ہے ؟ عرض کیا، اے رسول اللہؐ نہیں۔
آپ نے دریافت فرمایا ! کیا تم کنیز رکھتے ہو ؟
عرض کیا، یا رسول اللہؐ نہیں۔
حضورؐ نے فرمایا ! کیا تم مال دار ہو ؟
عرض کیا، ہاں. آپؐ نے فرمایا ! شادی کرلو ورنہ گناہ گاروں میں محسوب ہوگے۔
دوسری روایت میں ہے :
ورنہ تم شیطان کے بھائیوں میں شمار کیے جاؤ گے۔

---

[1] فصل فی التزویج، جامع الاخبار [2] فصل فی التزویج، جامع الاخبار

[3] فصل فی التزویج، جامع الاخبار۔

روٹی، کپڑا، مکان کی طرح جنسی خواہش کی ضرورت اور اسکی تکمیل بھی منجملہ انسانی حقوق کے تسلیم کی گئی ہے، بھوک سے نڈھال آدمی کو خوش ذائقہ، نفیس، عمدہ اور حلال غذا میسر نہ ہو تو بالآخر روکھی سوکھی، گلی سڑی اور حرام غذا ہی کے ذریعے اپنی بھوک مٹانے کی سوچتا ہے۔ اسی طرح سن بلوغ کے بعد جنسی خواہش کی تکمیل کی جائز طور سے سبیل نہ نکلنے پر آدمی غلط طریقے اختیار کرتا ہے اور یوں جنسی بے راہ روی مختلف روپ میں انسانی معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، اس کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے شادی کو نہ صرف جائز بلکہ اس کے بغیر حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو واجب قرار دے دیا، شادی شدہ کی عبادت کا ثواب بھی کئی گنا تجویز کیا گیا ہے اور مختلف انداز سے شادی کی ترغیب دی گئی ہے۔ لڑکیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سن بلوغ کا آغاز ہوتے ہی ان کی شادیاں ہو جائیں، درخت پر پھل پکنے کے بعد اسے یوں ہی چھوڑ دیا اور توڑا نہ جائے تو اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

محمد بن یعقوب عن محمد بن یحییٰ عن بعض اصحابہ عن ابی عبد اللہ ع قال من سعادۃ المرء ان لا تطمث بنتہ فی بیتہ

محمد بن یعقوب نے محمد بن یحییٰ سے، انھوں نے اپنے بعض اصحاب سے، انھوں نے حضرت ابو عبد اللہ ع سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا، آدمی کیلئے سعادت کی بات یہ ہے کہ اسکی بیٹی اسکے گھر میں حائض نہ ہونے پائے (یعنی شوہر کے گھر پہنچنے کے بعد بالغ ہو)

وعن بعض اصحابنا قال الکلینی رح
سقط عنی اسنادہ قال ان اللہ عزوجل
لم یترک شیئاً مما یحتاج الیہ الا
وعلمہ نبیہ فکان من تعلیمہ ایاہ
انہ صعد المنبر ذات یوم فحمد اللہ
اثنی علیہ ثم قال :
ایھا الناس ان جبرئیل اتانی
عن اللطیف الخبیر فقال ان الابکار
بمنزلۃ الثمر علی الشجر اذا ادرک
ثمارھا فلم تجتن افسدتہ الشمس
ونثرتہ الریاح وکذلک الابکار
اذا درکن ما یدرک النساء
فلیس لھن دواء الا البعولۃ
والا لم یؤمن علیھن الفساد
لانھن بشر،
قال! فقام الیہ رجل
فقال یا رسول اللہ فمن نتزوج؟
فقال، الاکفاء. فقال
من الاکفاء؟ فقال، المؤمنون
الاکفاء، بعضھم اکفاء بعض

ہمارے بعض اصحاب سے مروی ہے کہ کلینی رح نے کہا کہ
اس حدیث کے بعض اسناد مجھ سے چھوٹ گئے جس میں فرمایا ہے کہ
خداوند عالم نے کوئی بھی چیز رسولؐ کو تعلیم کیے بغیر نہیں چھوڑی چنانچہ
ایک روز آپؐ منبر پر تشریف لیگئے اور خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد
ارشاد فرمایا کہ "اے لوگو! میرے پاس لطیف و خبیر ذات کیجانب سے
جبرئیل امین آئے اور کہا کہ :
دوشیزائیں درخت پر لگے پھلوں کے مانند ہیں، پکنے کے
بعد پھلوں کو یوں ہی چھوڑ دیا اور توڑا نہ جائے تو دھوپ انھیں خراب
کردے گی اور ہوائیں ادھر ادھر بکھیر دیں گی، اسی طرح
دوشیزگی کا علاج شادی کے سوا کچھ نہیں، ورنہ شادی کے بغیر
وہ فساد سے نہ بچ پائیں گی، اس لیے کہ وہ بھی تو بشر ہیں
راوی کہتا ہے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر دریافت کیا
یا رسول اللہؐ ان سے شادی کون کرے؟ آپ نے فرمایا،
ہمسر لوگ۔

پھر اس نے دریافت کیا،
ہمسر کون ہیں؟
آپ نے فرمایا، مومنین ایک دوسرے کے
ہمسر ہیں۔

ح وسایل الشیعۃ کتاب النکاح (باب استحباب تعجیل تزویج البنت عند بلوغھا وتحصینھا بالزوج)

بچپن سے شباب کی طرف قدم بڑھانے کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے،

اس میں ساری صنفی خصوصیتیں اور صلاحیتیں رفتہ رفتہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہیں نیز جملہ فطری قوتیں نشوونما پاکر بھرپور جوانی میں مکمل ہو جاتی ہیں، لیکن یہ بھی ایک بدیہی بات ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے بلوغ کا سن ایک نہیں ہوتا، لڑکی، لڑکے سے بہت پہلے بالغ ہو جاتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کے اعضاء و جوارح قوی، بالخصوص ذہانت حیرت انگیز طور پر تیزی سے بڑھ کر بہت جلد پختہ ہو جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ سب ملکوں میں سن بلوغ یکساں نہیں، گرم ملکوں میں لڑکیاں بہ نسبت سرد ممالک کے جلد بالغ ہو جاتی ہیں۔ یہ نکتہ بھی توجہ کا مستحق ہے کہ جن ممالک میں سن بلوغ دیر میں شروع ہوتا ہے وہاں حسن و جمال اور شباب میں ثبات و قرار بھی اتنی ہی زیادہ دیر تک باقی رہتا ہے، لہذا سن بلوغ کو قبل از وقت ظہور کی دعوت دینا، درحقیقت زوال شباب کو پیشگی مدعو کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن طبیعی اور قدرتی طور پر بالغ ہو جانے کے بعد پھر قانون معاشرت کے ذریعہ سن بلوغ اور شادی کی عمر کو پیچھے ڈھکیل کر شادی میں تاخیر کرنا فطرت کے خلاف یک گونہ محاذ آرائی ہے، کیا واقعی فطرت بلوغ کا دور آگے بڑھ سکتا ہے؟

نہیں ہرگز نہیں۔

تہذیب جدید و عصر حاضر نے ایک طرف تو قدم قدم پر جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والے اور جنسی خیالات و جذبات کو برانگیختہ کرنیوالے اسباب و محرکات کے ذریعہ موجودہ نسل کو قبل از وقت بالغ کر دیا ہے، دوسری طرف طبیعی بلوغ اور معاشرتی بلوغ میں غیر حقیقی تفریق قایم کر کے کئی سال کا فاصلہ بڑھا دیا ہے۔ ہر طرف عریانی، بے حیائی، رقص و سرود، مے نوشی و بادہ خواری، کیبرے ڈانس، عریاں رقص، کوک شاستر، فحش لٹریچر، برہنہ تصویریں، رومانی فلمیں عیاشی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں اور ع: "بآبر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی طرح داری سے عالم کون و فساد میں مدہوشی و مستی کا دور دورہ ہے، عالم بے خودی میں ارباب حل و عقد "خاندانی منصوبہ بندی" کا راگ الاپ رہے ہیں، آبادی پر قابو پانے کی اسکیمیں بنا رہے ہیں، برتھ کنٹرول کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں، مانع حمل طریقے اپنانے کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود دنیا کی آبادی راکٹی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں؟ شاید اس لیے کہ برتھ کنٹرول کے ہدایات پر صحیح طور پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے، مگر قطع نظر اس کے کہ برتھ کنٹرول کے موارد اور ارباب دانش و بینش کے نقطۂ نظر پر کوئی تبصرہ کیا جائے، یہاں اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برتھ کنٹرول کے ہدایات پر صحیح طور سے عملدرآمد نہ ہونے کی یقیناً کچھ اسباب و وجوہ ہیں، منجملہ دیگر وجوہ کے اہم وجہ طریقۂ کار اور نقطۂ نظر کا اختلاف و تضاد ہے۔

درحقیقت خاندانی منصوبہ بندی میں خلوص نیت وعمل کا فقدان ہے، اسی لیے اس میں کامیابی شامل حال نہیں، اسکا ثبوت یہ ہے کہ اس میں واقعی خلوص کارفرما ہوتا تو کنوارے ماں باپ کو عبرتناک سزائیں دے کر اور زنازاد بچوں کی پرورش وتربیت کی ذمہ داری تمام تر ان کے والدین پر عاید کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر جرمانے بھی کیے جاتے تو ناجائز اولاد کی درآمد وبرآمد کے بقدر یقیناً برتھ کنٹرول ہوجاتا، مگر دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ شادی کے ذریعے پیدا ہونے والے بچوں کے سلسلے میں تو "ہم دو اور ہمارے دو" کا مقولہ رٹایا جاتا ہے، لیکن بلاشادی پیدا کیے جانے والے بچوں کے لیے کوئی قید اور پابندی نہیں، بلکہ پوری پوری چھوٹ ہے کہ حسب حوصلہ وہمت جتنے بنائے جاسکیں بنائیں مشن اور حکومت دامے، درمے، سخنے ہر طرح خدمت کے لیے تیار ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا یہ چاہتی ہے کہ آبادی میں اضافہ جائز طریقے سے نہ ہونے پائے، ناجائز طریقے سے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دنیا سمجھتی ہے کہ جنسی عمل کی راہ میں حائل تمام پابندیاں اٹھا لینے اور باہمی اختلاط کی پوری آزادی ملنے، اسکولوں، کالجوں میں جنسی تعلیم دینے اور مانع حمل طریقے بتا دینے سے جنسی میلان میں کمی واقع ہوجائے گی، مگر واقعات وحالات اسکے برخلاف شہادت وثبوت پیش کر رہے ہیں، لاکھ ملمع کاری کی جائے، مگر حقیقت نہیں چھپا کرتی، چنانچہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک عریانی، فحاشی اور عیاشی میں ایک دوسرے سے گوی سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ باہمی اختلاط کی چھوٹ ملنے سے جنسی میلان میں کمی،

واقع ہونے کے بجائے طوفان بلاخیز میں اور شدت پیدا ہوگئی، اس سلسلے میں مشتے نمونہ از خروارے، صرف برطانیہ کے بارے میں ہفتہ روزہ "نئی دنیا" کا پیش کردہ ایک ہلکا سا خاکہ (اخباری رپورٹ کا) ہدیۂ ناظرین ہے:

سرخی: "برطانیہ کے معصوم بچے جنسی طوفان کے شکنجے میں"

اخبار لکھتا ہے کہ:

برطانیہ میں کمسن بچوں میں جنسی تعلق کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۶ سال کی عمر والی ۴۷ فیصد لڑکیاں اور ۸ سال کی عمر والی ۹۰ فیصد لڑکیاں جنسی تعلقات کے تجربات سے گزر چکی ہیں۔ مانع حمل تدابیر بڑے پیمانہ پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ۲۰ سال سے کم عمر والی لڑکیوں کے حمل ساقط کرانے کے واقعات کی تعداد بھی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اسکے باوجود کمسن بچیوں کے یہاں ناجائز بچوں کی ولادت کی شرح بڑھکر ۸۵ فیصد ہوگئی ہے جبکہ شادی کا تصور کم ہوتا جا رہا ہے اور ازدواجی زندگی کی مقبولیت بہت تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ اس صورت حال سے خود یورپ کا ایک بڑا طبقہ بیزار اور پریشان ہے۔ . . . . . .

. . . . . .

. . . . . .

برطانیہ میں اسقاط حمل ایکٹ ۱۹۸۸ء کے نفاذ کے بعد پہلے سال میں ۲۰ سال سے کم عمر والی چار ہزار لڑکیوں نے اپنے حمل ساقط کرائے، جبکہ یہ تعداد دو سال میں بڑھکر ۱۵ ہزار ہوگئی۔ اس رجحان پر قابو پانے کیلئے "دایاؤں اور گائنا کولوجسٹوں" کے شاہی کالج نے ۱۹۷۲ء میں اسکولوں میں مزید جنسی تعلیم دینے اور عورتوں کو

بڑے پیمانہ پر مانع حمل اشیاء کی فراہمی پر زور دیا گیا، الکا دعویٰ تھا کہ جنسی عمل کے تعلق سے ہر قسم کی کھلی آزادی دیدینے اور ہر قسم کی اخلاقی و قانونی پابندی ختم کردینے سے لوگوں میں اس طرف میلان میں کمی واقع ہوجائیگی، لیکن الکا یہ دعویٰ اور خیال خام انتہائی غلط اور غیر حقیقت پسندانہ تصور ثابت ہوا اور انکے اس دعویٰ پر عمل شروع کرنیکے چار سال بعد ۱۹۷۷ء میں ۲۰ سال سے کم عمر والی لڑکیوں کے حمل ساقط کرانیکے ۲۸۔ ہزار واقعات ہوئے اور اسکے بعد بھی اس شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ایک سال میں اس عمر والی لڑکیوں کے حمل ساقط کرانیکے واقعات کی تعداد ۴۰۔ ہزار پائی گئی اور جنسی آزادی کے تجربہ سے حالات میں کوئی بہتری آنیکے بجائے مزید بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اور کمسن بچوں کو جنسی تعلیم دینے نیز جنسی احتیاط اور جنسی آزادی کے نتائج انتہائی خراب برآمد ہو رہے ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق جہاں ۱۹۶۵ء میں ۱۶ سال کی عمر والی صرف ۱۰ فیصد لڑکیاں ہی جنسی تعلق کے تجربہ سے گزر سکی تھیں، ۱۹۸۸ء میں ان کی شرح ۴۰ فیصد ہوگئی، جبکہ اس دوران ۱۸ سال کی عمر والی ایسی لڑکیوں کی شرح ۲۵ سے بڑھکر ۹۰ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ ظاہر ہے اس شرح سے استقرار حمل کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور چونکہ یہ حمل کنواری لڑکیوں کو ناجائز تعلق کے نتیجے میں ٹھہرتے ہیں اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں اسلیے ساقط کرادیے جاتے ہیں، اسکے باوجود ۱۹۶۶ء میں ناجائز بچوں کی پیدائش کی شرح ۲۵ فیصد تھی اب ۸۵ فیصد تک پہنچ چکی ہے۔" ؎

؎ ہفت روزہ نئی دنیا۔ ۱۸۔ تا ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء

مذکورہ واقعات وحالات سے پتہ چلتا ہے کہ جنسیات کو بیدار کرنے اور جذبات کو برانگیختہ کرنیوالے تعلیمات اور عوامل سے طوفان بلاخیز امڈ پڑا ہے، اب اسکو روکنے کیلیے ریت، بالو کے پشتے بنایے جارہے ہیں، مگر ریت کے تودوں سے کبھی سیلاب نہیں رُکا کرتے، بلکہ خس وخاشاک کے ساتھ ریت، مٹی کو بھی اپنے ہمراہ بہالے جاتے ہیں۔

غلط نظریات سے غلط نتائج برآمد ہونا ناگزیر ہے، ایک جھوٹ کو نباہنے کیلیے کئی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں پھر بھی کبھی نہ کبھی حقیقت بے نقاب ہو ہی جاتی ہے۔ دنیا نے جنسی تسکین کیلیے شادی کے بغیر، اس سے باہر جو راستے اپنایے وہ حالات میں سدھار لانیکے بجایے اور زیادہ بگاڑ کا موجب ثابت ہوے۔ نفسیاتی اعتبار سے نہ جذبات کا گلا گھونٹنا صحیح ہے اور نہ مطلق العنانی درست ہے، ہر چیز میں اعتدال قایم رکھنا عمدہ بات ہے۔ مانا کہ جوانی، دیوانی ہوتی ہے مگر ضرر رساں دیوانہ کو آزاد نہیں چھوڑا جاتا، قید وبند کے ساتھ علاج ومعالجہ کیا جاتا ہے، فطری تقاضوں کیلیے دین فطرت کے اصول وضوابط کی پابندی اور سعی کامراں درکار ہے، فیاض اور قادر مطلق ذات نے تشنگان راہ ہستی کیلیے ظلمات میں بھی چشمۂ آب حیواں بنادیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ضروریات زندگی، روٹی کپڑا، مکان کی طرح جنسی خواہش کی تکمیل بھی تقاضۂ فطرت ہے، مگر جس طرح ہوا، پانی، روٹی، کپڑا اور مکان کے سلسلے میں مضر صحت اور مفید صحت باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور آنکھیں بند کر کے ہر اچھی بری ہوا، پانی، روٹی، کپڑے، مکان کا استعمال مناسب نہیں ہے اسیطرح جنسیات کے

معاملہ میں بھی اندھی تقلید درست نہیں ہے۔

ہر طرف عریانی، رقص و سرود، مے نوشی و بادہ خواری، کیبرے ڈانس، عریاں رقص، فحش لٹریچر اور عیاشی کا دور دورہ ہے اور اسکے ساتھ ساتھ شادی کے لیے بلوغ کی مدت کو آگے بڑھا دیا گیا ہے، کیا فطری اور نفسیاتی اعتبار سے یہ اقدام صحیح ہے؟ روشن خیال دنیا خاندانی منصوبہ بندی کے تحت مانع حمل اور اسقاط حمل کے ذرائع اختیار کرنیکی تلقین تو کرتی ہے، لیکن جنسی بے راہروی پر کنٹرول کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتی، بلکہ ناجائز طور پر پیدا ہونیوالے بچوں کی پرورش و تربیت کیلیے عیسائی مشن اور حکومت کے ادارے گود پھیلائے انھیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور اسطرح زناکار والدین عبرتناک سزائیں پانے کے بجائے ان زنازاد بچوں کی پرورش و تربیت کی ذمہ داری سے بے نیاز اور بار کفالت سے آزاد رہتے ہیں، جنسی بے راہ روی کی یہ بھرپور حوصلہ افزائی ہی نہیں بلکہ خاندانی منصوبہ بندی کا شیرازہ منتشر کرنے کا پلان ہے۔

یہی معاملہ شادی کا ہے، بیک وقت ایک سے زاید عورتوں کو حبالہ عقد میں لانیکے لیے حکومت کی اجازت درکار ہے، لیکن بلا شادی سو عورتوں سے بھی تعلقات قایم کرنے میں کوئی قباحت نہیں، یہی نہیں بلکہ اب تو مرد، عورت کے دہن میں اپنی زبان رکھ کر اس سے کہلوا رہا ہے کہ جس طرح مرد ایک وقت میں متعدد عورتوں کو بیوی بنا سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ بیک وقت متعدد مردوں کو شوہر بنا لے، تاریخ اپنے کو دہراتی رہتی ہے، بیک وقت متعدد شوہروں کی بات کوئی نئی بات نہیں ہے،

یہ سب کچھ ہو چکا ہے، زمانۂ جاہلیت میں نہ صرف یہ طریقہ، بلکہ اس سلسلے میں کئی طریقے اور بھی موجود تھے۔ ان میں جو قباحتیں اس وقت پائی جاتی تھیں وہ آج بھی بعینہٖ موجود ہیں، پیغمبر اسلامؐ نے ان طریقوں کو مسترد قرار دیکر نکاح کا ایک شائستہ اور پاکیزہ طریقہ تعلیم فرمایا۔ اسلام نکاح کو محض جنسی تعلقات اور نفسانی خواہشوں کی تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ خاندان کی تشکیل اور شیرازہ بندی کا وسیلہ بھی جانتا ہے۔

تہذیب جدید کے مبلغین کا کہنا ہے کہ مرد نامعلوم زمانہ سے عملی طور پر ناجائز جنسی تعلقات رکھتے رہے ہیں، ایک مرد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ شادی کے وقت تک پاکباز رہا ہو، حتیٰ کہ تاہل کی زندگی کے بعد بھی مرد کا ہرجائی پن بہت زیادہ بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا، لہٰذا اگر مردوں کو قبل ازدواج جنسی روابط کی آزادی ہے تو عورتوں کو بھی یہ اجازت دینا ہوگی۔

مردوں کی بہت کم فیصد تعداد ایسی ہے جو اپنے برابر کے طبقہ کی عورت کے ساتھ متاہل زندگی میں داخل ہونے تک اپنے اوپر قابو رکھ سکے، لہٰذا جب غیر شادی شدہ مرد خود پر قابو نہیں رکھ سکتے تو مساوی حقوق کی بنیاد پر غیر شادی شدہ عورتیں بھی یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ انھیں بھی پاکباز رہنے کی ضرورت نہیں ہے، عورتوں کو بھی وہی حقوق ملنا چاہییں جو مردوں کو حاصل ہیں، جسطرح اپنی بیویوں سے دور، پردیس میں مردوں اور غیر شادی شدہ طالب علموں کے لیے

طوائف عورتوں کا ہونا ضروری ہے جو انکی جنسی خواہشوں کو پورا کرسکیں، اسی طرح غیر شادی شدہ عورتوں کے لیے بالخصوص ان ممالک میں جہاں عورتوں کی تعداد، مردوں سے زیادہ ہے، وہاں ایک طبقہ "مرد طوائفوں" کا بھی ہونا چاہیے تاکہ شادی سے محروم عورتیں ان "طوائف مردوں" سے شوہروں کا کام لیکر جنسی تسکین نیکنامی کے ساتھ حاصل کرسکیں اور جنسی لذت کے تجربہ سے محروم نہ رہنے پائیں، جنسی لذت سے لطف اندوز ہونا ہر مرد و عورت کا فطری حق ہے جو بہرحال ہر ایک کو ملنا چاہیے، اسکے لیے شادی کی قید بے معنی بات ہے، نیز یہ کہنا کہ مرد کے مقابلے میں عورت کیلیے عصمت و پاکبازی زیادہ ضروری ہے انسانی مساوات کے منافی ہے۔ رہا شادی کے بغیر پیدا ہونیوالے بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا معاملہ تو اس کا حل یہ ہے کہ مانع حمل طریقے اپنائے جائیں اور اولاد پیدا نہ کریں اور اگر غیر اختیاری طور پر پیدا ہو جائے تو اسکی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حکومت یا انسانی فلاح و بہبود کے ادارے قبول کریں، جیسا کہ عیسائی مشن وغیرہ کر رہے ہیں۔

شادی کا بنیادی مقصد جنسی تسکین ہے، وہ شادی کی قید و بند سے بے نیاز رہ کر آزادانہ طور پر بھی حاصل ہو سکتا ہے تو پھر شادی کے چکر میں کیوں پڑا جائے؟ حیوانات میں یہ سلسلہ کہاں ہے؟ شادی کی صورت میں مہر اور اسکے ساتھ ساتھ نان و نفقہ کی ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے، اگر لڑکے اور لڑکیاں طالب علمی کی زندگی

گزار رہے ہوتے ہیں تو جوانی کی امنگیں رہ رہ کر دل میں مچلتی اور چٹکیاں لیتی رہتی ہیں، جنسی تسکین کے بغیر ذہنی سکون اور خاطر جمعی میسر نہیں ہو پاتی، مگر طالب علمی کے دور میں باقاعدہ شادی، مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داری کیسے پوری کی جاسکتی ہے۔ ؟

اگر رسمی شادی ہی اٹل حکم ہے اور جنسی تسکین کا واحد ذریعہ ہے تو کیا دائمی شادی کے بجائے "وقتی شادی" عمل میں نہیں آسکتی، جو حسب ضرورت صرف ایک معین مدت کے لیے عمل میں لائی جائے اور مدت تمام ہو جانے پر بغیر طلاق کے خود بخود ختم ہو جائے۔ ؟

یہ جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں انکا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انمیں سے اکثر و بیشتر اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ مرد اور عورت میں کسی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، یہ دونوں ہر لحاظ سے تمام قوتوں، صلاحیتوں اور حقوق و فرائض میں یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مرد اور عورت میں من جمیع الجہات نہ یکسانیت ہے اور نہ دونوں کے حقوق و فرائض میں کلی طور پر مساوات قایم ہو سکتی ہے، زبردستی مساوات پیدا کرنے کی کوشش، قانون فطرت سے ٹکرانا ہے، ہاں! اپنے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر ایک مرد و عورت کو اپنے پیدائشی اور فطری حقوق کے مطالبہ اور انھیں بروئے کار لانے کا پورا پورا حق پہنچتا ہے۔

شادی کا بنیادی مقصد صرف جنسی تسکین ہی نہیں، بلکہ افزائش نسل بھی ہے، لیکن حیوانات کی طرح نہیں، ان میں خاندان کی تشکیل اور شیرازہ بندی کا معاملہ ہے، نہ تقسیم میراث کا مرحلہ اور نہ ہی محرم و نامحرم کا مسئلہ۔

شادی انسانی فطرت کی طلب ہے لہذا انسان ہونے کے ناطے مرد اور عورت کو مساوی طور پر شادی کا حق پہنچتا ہے، ان میں سے کسی کو اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا، لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر مرد بیک وقت متعدد عورتوں سے شادی کرسکتا ہے تو عورت بھی بیک وقت متعدد مردوں سے شادی کرنے کی مجاز ہے۔ صنفی اعتبار سے دونوں میں فرق پایا جاتا ہے، یہ صنفی فرق زندگی کے ہر ہر لمحہ اور زندگی کی آخری سانس تک میں باقی رہتا ہے تو پھر صنفی حقوق و فرائض کی تعیین کے وقت اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

دنیا میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہونیکی صورت میں "ایک مرد ایک بیوی" کے فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے بقیہ زاید عورتوں کیلیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ "وہ اولاد سے محروم نہ رہیں، بلا شادی کے مردوں کو اپنے پھندے میں پھانسیں اور "بے پدر اولاد" پیدا کریں اور حکومت زچہ بچہ دونوں کی کفالت کی ذمہ دار بنے۔

اس تجویز سے کئی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں، ان میں سے ہر ایک پر تجزیاتی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۔ "ایک مرد اور ایک بیوی" کے بقدر عائلی زندگی بسر کرنا مرد و زن کا بنیادی حق ہے۔

۲۔ صاحب اولاد ہونا ہر عورت کا فطری حق ہے، اسکے لیے مرد کو اپنے پھندے میں پھانس کر "بے پدر اولاد" پیدا کرنے کا اقدام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

۳۔ زچہ بچہ کی کفالت کی ذمہ داری حکومت کو قبول کرنا چاہیے

اب یکے بعد دیگرے ان میں سے ہر ایک پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

"ایک مرد اور ایک بیوی" کے بعد عائلی زندگی مرد و زن کا بنیادی حق ہے:

(۱) غالباً مرد و زن میں ہمہ جہتی مساوات تسلیم کرتے ہوئے یہ فارمولہ بنایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس جس بات کا، جتنا جتنا حق مرد کو پہنچتا ہے ویسا اور اتنا ہی عورت کو بھی پہنچتا ہے، مرد اور عورت میں ہمہ جہتی مساوات مان لینا عورت اور مرد کی صنفی دوئی اور مغائرت وجود کی نفی ہے۔ اس سے پہلے اس پہلو پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مرد اور عورت انسان ہونے کے ناطے صرف انسانی حقوق و فرائض میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں مگر صنفی اعتبار سے دونوں میں مغائرت ہے لہذا دونوں کے صنفی حقوق و فرائض بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

شادی ہر مرد اور عورت کا بنیادی حق ہے تو ہر ہر مرد کے لیے ایک ایک بیوی کا فارمولہ بنا کر بقیہ زاید عورتوں کو شادی کے حق سے محروم کر دینا کیونکر حق و انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے؟ اگر شادی کرنا کوئی فضل و شرف کی بات ہے تو کچھ کو اس سے مشرف ہونے کا موقع دینا اور کچھ کو محروم رکھنا کیا انصاف ہے

MAULANA AZAD LIBRARY
ACC No.
DS 2437
Aligarh

بات نہیں ؟ اور اگر شوہر بیوی بننا کوئی باعث شرف چیز نہیں تو ایک مرد کے لیے ایک ہی عورت کیوں بیوی قرار دی جاتی ہے ؟ اسی طرح شوہر کے ذریعہ پیدا ہونیوالی اولاد تہذیب جدید کی اصطلاح میں " باپدر اولاد " کہلاتی ہے اور شادی سے محروم عورتیں مردوں کو اپنے پھندے میں پھانس کر جو اولاد جنیں وہ " بے پدر اولاد " ہوتی ہے تو یہ آیا محض لفظی فرق ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی امتیاز پایا جاتا ہے ؟

سچ تو یہ ہے کہ اس میں ایک لفظی فرق ہی نہیں، بہت کچھ بنیادی فرق پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو اسے " بے پدر " بنا کر باپ کے ورثہ اور شفقت سے محروم کر دیا گیا، دوسری طرف حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر لاوارث بنا دیا گیا۔ عورت کے لیے شوہر کی رفاقت اور بچہ کے حق میں باپ کا سایۂ عاطفت، دست شفقت لایعنی چیز نہیں، ورنہ شوہر دار عورت کے بچہ کی کفالت کی ذمہ داری شوہر پر اور بے شوہر عورت کے بچہ کی کفالت حکومت کے ذمہ نہ کی جاتی، یہ تفریق خود بتا رہی ہے کہ دونوں طرح کی عورتوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

یہ کہنا بہت آسان ہے کہ مرد کو بیک وقت متعدد عورتوں سے تعلقات قائم کرنے کا حق ہے تو عورت کو بھی متعدد مردوں سے رابطہ و ضبط پیدا کرنے کی اجازت ملنا لازمی ہونا چاہیے، مگر کیا صاحب اولاد بننے، بنانے کی مرد و عورت یکساں صلاحیت رکھتے ہیں ؟ مرد ایک وقت میں چار عورتوں سے جنسی عمل کر کے چاروں کو باردار بنا سکتا ہے، مگر کیا ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے ہمبستر ہو کر چار بچے جن سکتی ہے ؟

نہیں ہرگز نہیں، عورت انگنت مردوں سے تعلقات قایم کرکے نو ماہ کی مدت میں عام طور سے ایک ہی بچہ جن پاتی ہے، جبکہ مرد اتنی مدت میں بہت سی عورتوں سے مباشرت کرکے بہت سے بچے جنوا سکتا ہے نیز ایک عورت ایک تندرست مرد کا تحمل نہیں کرسکتی اور مسلسل توالد و تناسل سے تھک کر دم توڑ دیتی ہے، حمل ضایع جاتے ہیں، اسقاط ہوتے ہیں، ہر چھٹے مہینے استقرار حمل ہوجاتا ہے اور ایک کثیر تعداد کمسن بچوں کی پرورش، سانس لینے کی مہلت نہیں دے پاتی تو اگر ایک عورت چار مردوں کی زوجیت میں جاتی تو کسی ایک کے حقوق بھی ادا نہ کرپاتی۔

اس لیے نہ تو "ایک مرد کے لیے ایک بیوی کا فارمولہ" فٹ بیٹھتا ہے اور نہ ہی ایک عورت کے لیے متعدد شوہروں کا فارمولہ درست قرار پاسکتا ہے۔ نیز مردوں کی تعداد سے زاید عورتوں کو جب صاحب اولاد بننے کے لیے شادی شدہ مردوں سے رجوع کرنا ناگزیر ہے تو پھر بیوی بن کر ہی کیوں نہ رجوع کیا جایے، تاکہ ان میں سے ہر ایک کو "شوہر دار عورت" کا اور پیدا ہونیوالے بچوں کو "باپدار اولاد" ہونے کا شرف بھی نصیب ہوسکے اور کسی کو کسی قسم کا احساس کمتری بھی نہ ہونے پایے۔

بیک وقت چار عورتوں کو حبالۂ عقد میں لاکر اور یکے بعد دیگرے ہر ایک کو حامل اولاد بناکر بھی مرد مزید جنسی عمل کا متمنی رہتا ہے، جبکہ حمل کے زمانہ میں عورت کی طبیعت جنین کی ساخت و پرداخت کی طرف ملتفت ہوتی ہے اور جنسی عمل سے رغبت نہیں رہتی، نیز حمل قرار پانے کے بعد عورت کے ہر سکون و حرکت اور حالت و کیفیت کا اثر جنین پر بھی پڑتا ہے، اس لیے پوری مدت حمل کے دوران عورت کو ہر اعتبار سے

محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے ، نو ماہ کے اس طویل عرصہ میں مرد کا اپنی جنسی خواہشوں پر کنٹرول کرنا اور جنسی عمل سے باز رہنا نہ طبی نقطۂ نظر سے سود مند ہے اور نہ نفسیاتی اعتبار سے مناسب ہے، تو پھر اس فطری طلب کا فطری حل کیا ہو سکتا ہے ؟

مرد کو بیک وقت ایک سے زاید عورتوں سے شادی کرنے کا حق نہ دے کر ہمجنس بازی کی اجازت دے دینا آیا اس مسئلہ کا فطری حق اور طبی نقطۂ نظر سے مفید صحت عمل ہے۔؟

ہمجنس بازی اگر اس لیے ہے کہ مردوں کی تعداد کے بقدر عورتیں موجود نہیں ہیں اور ایک مرد ایک بیوی کے فارمولہ پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا، تو یہ بات سراسر غلط ہے عالمی آبادی کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

ہو سکتا ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ عورتوں سے جنسی عمل کے نتیجے میں بچے پیدا ہونے کے امکانات ہیں اور ہمجنسی کی صورت میں نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمجنس بازی سے بچے پیدا نہ ہوں گے، لیکن اسطرح سوزاک جیسے موذی اور متعدی امراض میں مبتلا ہو کر مردوں کے مرنے سے شادی اور جنسی لذت سے محروم عورتوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ حالت حیض میں عورت کی طبیعت جنسی عمل سے منغض ہونے کے علاوہ مرد کو سوزاک ہو جانیکے قوی امکانات ہوتے ہیں، قرآن مجید اس حالت کو گندگی، پلیدگی اور گھن کی بیماری قرار دیتے ہوئے اس عالم میں عورتوں سے الگ رہنے کا حکم دیتا ہے، چنانچہ قرآنی ارشاد ہے۔ :

ویسئلونک عن المحیض ط
قل ھو اذیً فاعتزلوا النساء
فی المحیض ولا تقربوھن
حتی یطھرن فاذا تطھرن
فاتوھن من حیث امرکم اللہ
ان اللہ یحب التوابین و
یحب المتطھرین ۵ ؎۱

(اے رسولؐ) تم سے لوگ حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، تم ان سے کہدو کہ یہ گندگی اور گھن کی بیماری ہے، تم حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور جبتک وہ پاک نہ ہو جائیں انکے پاس نہ جاؤ، پس جب وہ پاک ہو جائیں تو جدھر سے تمہیں خدا نے حکم دیا ہے ان کے پاس جاؤ۔ بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

نساؤکم حرث لکم
فاتوا حرثکم انی شئتم
وقدموا لانفسکم واتقوا اللہ
واعلموا انکم ملٰقوہ ۵ ؎۲

تمہاری بیبیاں تمہاری کھیتیاں ہیں، جسطرح چاہو آؤ اور اپنی آئندہ کی بھلائی کے واسطے (اعمال صالحہ) پیشگی بھیجو اور خدا سے ڈرتے رہو اور یہ بھی سمجھ رکھو کہ (ایک نہ ایک دن) تمکو اسکے سامنے جانا ہے،

غور طلب بات یہ ہے کہ حیض کے زمانے میں عورت کی طبیعت گندہ خون خارج کرنے کی طرف مایل ہوتی ہے اور مرد کی طبیعت جماع کے وقت منی نکالنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، چنانچہ ادھر عورت کی اندام نہانی اور ادھر مرد کے عضو تناسل کے مسامات کھل جاتے ہیں، خون حیض کے بخارات عضو تناسل پر برے اثرات ڈالتے ہیں اور خون حیض سوراخ ذکر میں داخل ہو کر سوزاک جیسی بیماری پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے تو کیا مقعد میں

؎۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۴ ؎۲ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۳

لواطہ کرنے پر مقعد میں موجود گندگی، فضلہ کے بخارات اور ذرات سوراخ ذکر میں داخل ہو کر بھیانک بیماریاں پیدا کرنے کا سبب نہ بنیں گے؟ بعض اوقات عورتوں کو مرض "ورم مقعد سوزاکی" ہوتا ہے، اندام نہانی سے پیپ بہہ کر مقعد میں جا لگتی ہے، کبھی "لواطت" سے یہ مرض ہو جاتا ہے، مقعد میں درد ہوتا اور پیپ آتی ہے، یہ مرض جراثیم سوزاک کے متصلہ ساختوں میں پھیل جانے، دیگر مقامات میں منتقل ہو جانے اور خون میں سرایت کر جانے سے ورم حشفہ، ورم غدۂ مذی، ورم خصیۂ سوزاکی، ورم مثانہ سوزاکی، ورم مقعد سوزاکی، سوزاک انفی، ورم لیفی، ورم صلبیہ سوزاکی، عفونت خون سوزاکی اور سوزاکی گٹھیا وغیرہ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی یہ مرض بہت پایا جاتا ہے جسے عیاش مرد بازاری عورتوں سے مل کر اپنی بیویوں میں منتقل کرتے ہیں۔

حضرت لوطؑ کی قوم ہمجنس بازی کے غیر فطری عمل کی بدولت آسمان سے پتھر برسا کر ہلاک کر دی گئی اور بستی سدوم الٹ کر تباہ کر ڈالی گئی جیسا کہ قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے۔:

۔ سوزاک کے عوارض مخزن حکمت (شمس الاطبا ڈاکٹر و حکیم غلام جیلانی)
از ص: ۱۱۹۱ تا ۱۱۹۶
جلد اول

فاخذتھم الصیحۃ مشرقین
فجعلنا عالیھا سافلھا وامطرنا
علیھم حجارۃ من سجیل ۰
ان فی ذلک لایۃ للمتوسمین ۰
وانھا لبسبیل مقیم ۰
ان فی ذلک لایۃ للمؤمنین ۰ [1]

پس سورج نکلتے نکلتے انکو (بڑے زوروں کی)
چنگھاڑ نے لے ڈالا، پھر ہم نے اس بستی کو الٹ کر اسکے اوپر کے طبقے کو
اسکے نیچے کا طبقہ بنادیا، اور اسپر کھڑنجے کے پتھر برسا دیے
بیشک اسمیں (اصلی باتیں) تاڑ جانیوالوں کیلیے (قدرت خدا کی)
بہت سی نشانیاں ہیں، اور وہ الٹی ہوئی بستی ہمیشہ (کی آمدورفت) کے
راستہ پر ہے، اسمیں شک نہیں کہ اسمیں ایمان والونکے لیے (قدرت کی)
بہت بڑی نشانی ہے۔

دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے:

ولما جآءت رسلنا لوطاً
سیٓء بھم وضاق بھم ذرعاً
وقال ھذا یوم عصیب ۰
وجآءہٗ قومہ یھرعون الیہ
ومن قبل کانوا یعملون السیات ط
قال یقوم ھٰؤلآء بناتی
ھن اطھر لکم فاتقوا اللہ
ولا تخزون فی ضیفی ط الیس
منکم رجل رشید ۰ قالوا
لقد علمت مالنا فی بناتک من حق [2]

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (لڑکونکی صورت میں)
لوطؑ کے پاس آئے تو انکے خیال سے رنجیدہ ہوئے اور
انکے آنے سے تنگدل ہوگئے اور یہ کہنے لگے کہ یہ (آج کا دن)
سخت مصیبت کا دن ہے اور انکی قوم (لڑکوں کا آنا سنکر برے ارادے سے)
ان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی اور یہ لوگ اس سے قبل بھی برے برے
کام کیا کرتے تھے، لوطؑ نے (جب انکو آتے دیکھا تو) کہا ایے
میری قوم یہ میری قوم کی بیٹیاں (موجود ہیں) ان سے نکاح کرلو
یہ تمہارے واسطے جائز اور زیادہ پاک و پاکیزہ ہیں، خدا سے ڈرو
اور مجھے میرے مہمان کے بارے میں رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی
سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا، تمکو تو
خوب معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی لڑکیونکی ہمیں کچھ حاجت نہیں ہے۔

---

[1] سورۃ الحجر، از آیت ۷۳ تا ۷۷ [2] سورہ ھود آیت ۷۷-۷۸

وانك لتعلم ما نريد[1] ۝ — اور جو بات ہم چاہتے ہیں وہ تم خوب جانتے ہو۔

یہ لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچے، عذاب الٰہی نے آلیا اور انھیں تہس نہس کر ڈالا۔ چنانچہ قرآن بتاتا ہے کہ:

فلما جاء امرنا جعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليها حجارة من سجيل منضود[2] ۝ — پس جب ہمارا (عذاب کا) حکم آپہنچا تو ہمنے اس بستی کو الٹ کر اسکے اوپر کے حصہ کو اسکے نیچے کا بنا دیا اور اس پر ہمنے کھرنجے کے پتھر تابڑ توڑ برسائے۔

اس غیر فطری بدفعلی کی حرمت پر احادیث نے بھی مختلف انداز میں روشنی ڈالی ہے:

وقال رسول الله ص من نكح امرأة في دبرها او غلاما في دبره او رجلا حشره الله عز وجل يوم القيمة انتن من الجيفة يتاذى به الناس حتى يدخل جهنم ۝[3] — رسول اللہ ص نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی کسی عورت، لڑکے یا مرد کی دبر میں بدفعلی کرے تو خدا قیامت کے دن اسے اس عالم میں محشور فرمائے گا کہ اسکے جسم سے لوگوں کو سڑے ہوئے مردار کی اذیت ناک بدبو آرہی ہوگی، یہانتک کہ وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

دوسری حدیث:

قال رسول الله ص من جامع غلاما جاء جنبا يوم القيمة لا ينقيه ماء الدنيا وغضب الله عليه واعد لهم جهنم وساءت مصيرا[4] — ارشاد رسول ص ہے کہ: جسنے کسی لڑکے سے مباشرت کی تو وہ قیامت کے دن ایسے جنب کی حالت میں آئیگا جسے دنیا کا پانی پاک وصاف نہ کر پائے گا، اس پر خدا کا غضب ہو، اس کے لیے جہنم طے ہے اور (وہ کیا ہی) برا ٹھکانا ہے۔

---

[1] سورہ ہود آیت ۷۹ [2] سورہ ہود آیت ۸۲ [3] فصل فی اللواطہ (جامع الاخبار)

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

وقال الصادقؑ : حرمة الدبر اعظم من حرمة الفرج ، ان اللہ ھلک امة بحرمة الدبر ولم یھلک احدا بحرمة الفرج ۔ [1]

صادق آل محمدؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مقعد کی حرمت، فرج کی حرمت سے عظیم ہے، اللہ تعالیٰ نے حرمت دبر کی بدولت پوری قوم (لوط) کو ہلاک فرمادیا اور حرمت فرج پر ایک شخص بھی ہلاک نہیں ہوا ۔

موجودہ دور میں تہذیب جدید کے متوالوں کا شادی سے گریز اور آزادانہ جنسی تعلقات کی طرف رغبت بے محابہ تعیش پسندی کی عکاس ہے، جس طرح لو لگا شخص جتنا پانی پیتا ہے اتنی ہی پیاس اور بھڑکتی جاتی ہے، اسی طرح بے قید جنسی حرص و ہوس میں التہابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور سر سے پاؤں تک اسمیں ڈوب جانیکے باوجود نفس کی تسکین نہیں ہو پاتی ۔ البتہ یہ بات یقیناً غور طلب اور ہمدردی کی مستحق ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہونیکی صورت میں ان کی جنسی خواہش کی تسکین کا حامل ہونا چاہیے ۔

اسلام نے تمام مردوں اور ساری عورتوں کی فطری مانگ اور ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے، چنانچہ ایک مرد کو بیک وقت چار عورتوں سے عقد دائمی اور

---

[1] الباب الثانی فی اللواط والسحق والقیادة ، کتاب الحدود جواھر الکلام الشیخ محمد حسن رح

حسب ضرورت ان سے "عقد منقطع" کرنے کی اجازت دے کر مردوں کی تعداد سے زاید عورتوں کے لیے "صاحب شوہر" اور "صاحب اولاد" ہونے کا باوقار اور عادلانہ موقع فراہم کیا ہے، نیز بیک وقت ایک زاید عورتوں کو حبالۂ عقد میں لانے کے لیے ان کے مابین عدل و انصاف قایم رکھ سکنے کی شرط لگا کر مرد کو سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا خوگر بننے کی دعوت دی گئی ہے۔

عصر جدید کے دانشوروں نے "رفاقتی شادی" (Companionate Marriage) اور "آزمائشی شادی" (Trail Marriage) وغیرہ کی جو تجویز پیش کی تھی اس کے پس منظر میں "عقد منقطع" عارضی شادی کی جھلکیاں ملتی ہیں مگر اسلامی "عارضی شادی" ایک منظم و مکمل شادی ہے اور اسکے جملہ احکام وہی ہیں جو عقد دایم کے ہیں، البتہ ایک بنیادی اور اہم فرق یہ ضرور ہے کہ عقد دایم میں مدت عقد معین نہیں ہوتی جبکہ عارضی شادی میں مدت کا تعین لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں اپنے وطن سے دور دیگر ممالک میں تجرد کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے لیے طویل مدت تک جنسی خواہشوں کو قابو میں رکھنا بہت مشکل کام ہے، اکثر اوقات ضبط نفس سے نفسیاتی اور داخلی امراض لاحق ہو جاتے ہیں، مگر معقول ذرائع آمدنی

Marriage and Morals. by Bertiand Russell
Page No. 74

نہ ہونیکی وجہ سے عقد دائم نہیں کرسکتے، اس لیے کہ اس میں مہر کے علاوہ نان ونفقہ کی تمام تر ذمہ داری بھی مرد کو نبھانی ہوتی ہے، لہذا ایسے اشخاص کی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لیے وقتی شادی موزوں ہے، جسے برٹرینڈ رسل نے "رفاقتی شادی" سے تعبیر کیا ہے۔

وقتی شادی کے لیے مذکورہ بالا دواعی کے علاوہ اور بھی تقاضے ہوسکتے ہیں، نیز عقد دائم کے مقابلے میں اس میں بہت کچھ آسانیاں ہیں، حسب ضرورت طرفین یعنی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے جو شرائط رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں اور طے کردہ شرائط کے دونوں پابند رہیں گے۔

اگر بیوی کے نان ونفقہ کو برداشت کرنے کی مرد قدرت نہیں رکھتا اور عورت نان ونفقہ چاہے بغیر شادی پر تیار ہو، نیز مہر بھی کم سے کم اور بآسانی ادا ہوسکنے والا طے کرلیا جائے تو کوئی مضایقہ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی شادی میں مہر اور نان ونفقہ بنیادی چیزیں ہیں، مگر لَا یُکَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا (کسی شخص کو زحمت نہیں دی جاتی مگر اسکی گنجائش بھر) اسلام کا مسلّمہ کلیہ ہے، اسلام نے عورت کا مہر اور نان ونفقہ یقیناً مرد پر واجب قرار دیا ہے، لیکن نہ مہر کی کم سے کم مقدار کا تعین کیا گیا ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ مقدار کا، اس سے یہ بات

ص سورۃ البقرہ آیت ۲۳۳۔

روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر مرد و زن شادی کو فطرت کی طلب اور منجملہ ضروریات زندگی متصور کرتے ہوئے اختیار کریں تو مقتضائے حال کے مطابق اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور مہر حسب حال کم سے کم مقدار میں مقرر کیا جا سکتا ہے، نیز عورت بعد کو چاہے تو معاف بھی کر سکتی ہے، اسکے علاوہ مشن، فلاحی ادارے اور حکومت ناجائز بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتی ہے تو ایسے اشخاص کے ضروری اخراجات و مصارف کی ذمہ دار بننے میں کس لیے پس و پیش ہے ؟

عارضی شادی میں مہر کی طرح مدت نکاح کا تعین بھی خود اختیاری ہے، مرد و زن کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ جتنی مدت رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں، اس تعین مدت کی وجہ سے اسے نکاح میں شامل نہ سمجھنا لایعنی بات ہے، اس لیے کہ چند باتوں کے علاوہ عارضی شادی کے سارے احکام وہی ہیں جو دائمی شادی کے، اور اس جزوی فرق میں بھی وہی حقیقت کلیہ اور فلسفہ کارفرما ہے جو نکاح کی ضرورت اور اسکی غرض و غایت ہے۔

نکاح میں مہر کا ہونا ضروری ہے، مگر عقد دائم میں مہر کا ذکر ضروری نہیں، جبکہ عارضی عقد میں مدت کے ساتھ ساتھ مہر کا تعین اور ذکر ضروری ہے، عارضی عقد کا یہ جزوی فرق بھی سچ پوچھیے تو نوعیت نکاح اور اہمیت نکاح کو

اور واضح کر دیتا ہے، اس میں یہ تاثر بھی مضمر ہے کہ وہ چیز جسے عام طور پر جذبات کی دین کہا جاتا ہے، اسے بقاعدہ ایک ضابطہ اور معاہدہ کی شکل میں اپنایا جائے تاکہ جذباتی زندگی میں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام بھی ملحوظ رہے اور باہمی قرارداد کا پاس و لحاظ بھی، دائمی عقد میں مہر کا ذکر نہ کیا جائے تو عقد باطل نہیں ہوتا بلکہ "مہر بالمثل" معین ہو جاتا ہے، مگر عارضی عقد میں مہر اور مدت کا تعین ضروری ہے ورنہ عقد باطل رہے گا۔

دائمی عقد میں شوہر، زوجہ کے نان و نفقہ، لباس و مکان، علاج و معالجہ اور دیگر ضروریات زندگی کا کفیل و ذمہ ہوتا ہے، لیکن "عارضی شادی" میں حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں اور آزادیاں معاہدہ اور قرارداد پر مبنی ہیں۔

دائمی نکاح میں بیوی کی رضامندی کے بغیر "عزل" یا کسی اور مانع حمل اقدام کا شوہر کو حق حاصل نہیں، لیکن عارضی نکاح میں بیوی کی رضامندی کی ضرورت نہیں[1]، ہاں عورت کیلئے بھی ایسی مانع حمل چیز کا استعمال جائز ہے جو زیادہ نقصان دہ نہ ہو، خواہ اسکا شوہر اس چیز کے استعمال پر راضی نہ بھی ہو، لیکن اسکے لیے "اسقاط حمل" جائز نہیں، خواہ نطفے کی حالت میں ہی ہو[2]۔

---

[1] مسألة ۱۳، القول فی النکاح المنقطع تحریر الوسیلة ج ۲ ص: ۲۹۱

[2] مسئلة ۲۹۱۵ ص: ۴۴۶ توضیح المسائل آیة اللہ العظمیٰ الخوئی

اس اعتبار سے عارضی شادی موجودہ دور کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام یعنی برتھ کنٹرول سے بھی ہم آہنگ ہونیکی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، میاں بیوی چاہیں تو دونوں ضبط تولید کا پہلے سے معاہدہ کرسکتے ہیں، یعنی یہ طے کرسکتے ہیں کہ مقصد نکاح صرف جنسی تسکین رہے گا اولاد پیدا کرنا نہیں۔ عام طور پر عقد دائمی کا مقصد تولید نسل اور عارضی عقد (عقد موقت) کا مقصد جنسی تسکین ہوتا ہے، لیکن عقد موقت میں بیوی اگر یہ شرط عاید کرے کہ شوہر اس سے مجامعت نہ کرے تو عقد اور عاید کردہ شرط صحیح ہے اور شوہر اس سے فقط دوسری لذتیں حاصل کرسکتا ہے، لیکن اگر وہ بعد میں راضی ہوجائے تو شوہر اس سے مجامعت کرسکتا ہے۔[1]

عارضی شادی میں میاں بیوی کو بچہ پیدا کرنے کا بھی اختیار ہے، دونوں چاہیں تو شوق سے بچہ پیدا کریں ورنہ نہیں، اولاد پیدا کرنے نہ کرنے کا حق نطفہ قایم ہونے سے پہلے پہلے تو ہے، لیکن انعقاد نطفہ کے بعد بچہ کی تخلیقی منزل شروع ہونے پر اسے ضایع کرنیکی اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں نفس انسانی کتنا محترم ہے اور جو اسلام تخلیق کی ابتدائی منزل میں حقوق انسانی کا اتنا نگہبان ہے، وہ تکمیل حیات کی منزلوں میں کیسے نگراں نہ ہوگا۔

عارضی نکاح اور دائمی نکاح سے پیدا شدہ اولاد میں کوئی فرق نہیں، دونوں برابر کے حقدار اور حصہ دار ہیں، دونوں پر حسب و نسب اور میراث کے تمام احکام

---

[1] مسئلہ ۲۴۳۲، ص: ۲۶۳ بحث متعہ (ازدواج موقت) توضیح المسائل آیۃ اللہ العظمیٰ الخوئی

یکساں طور پر جاری ہوں گے، ہاں عارضی نکاح میں میاں بیوی ایک دوسرے کا ترکہ نہیں پاتے۔

شریعت اسلام نکاح کو ہوس رانی کا ذریعہ قرار نہیں دیتی بلکہ جنسی خواہش کو خلوص و محبت اور پاکیزگی سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے، اس لیے قبل اسلام جنسی عمل کے وہ تمام طریقے جو نام نکاح فحاشی و عیاشی کے ترجمان تھے ان سب کو ختم کر کے مہذب اور شائستہ نکاح کو اپنی سنت قرار دیا، سنت رسول میں قول و فعل اور تقریر تینوں چیزیں شامل ہیں، مسلمانوں کا اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ صدر اسلام میں "عقد موقت" جائز تھا، رسول اللہؐ نے ان مسلمانوں کو جن کی بیویاں ان سے دور تھیں، سفر میں عقد موقت کی اجازت دی تھی، چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں اور ختمی مرتبت کے بعد حضرت ابوبکر کے پورے دور تک اس پر عمل ہوتا رہا، حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اسے حرام کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ جملہ فرمایا جیسے علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں آیہ "فما استمتعتم بہ منھن"[1] کے ذیل میں تحریر کیا ہے:

متعتان کانتا علی عھد رسول اللہؐ انا محرمھن ومعاقب علیھن: متعۃ الحج، متعۃ النساء	رسولؐ کے زمانہ میں دو متعہ رائج و جائز تھے متعۃ الحج اور متعۃ النساء، میں دونوں سے منع کرتا ہوں اور جو شخص انھیں عمل میں لائے گا اسے سزا دوں گا۔

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳۔ ص: ۲۰۰، ۲۰۲

دوسری روایت : اخرج الطبری [فی المستبین] عن عمر قال :

ثلٰث کن علیٰ عهد رسول اللہؐ انا محرمهن ومعاقب علیهن : متعة الحج، متعة النساء وحی علیٰ خیر العمل فی الاذان [1]	تین چیزیں عہد رسولؐ میں موجود تھیں، میں انھیں حرام قرار دیتا ہوں اور جو بھی انپر عمل پیرا ہوگا اسے سزا دونگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں : متعۃ الحج، متعۃ النساء اور اذان میں حی علیٰ خیر العمل

اس سلسلہ میں متعدد اور مختلف حدیثیں اور روایتیں وارد ہوئی ہیں لیکن اس وقت کسی اختلافی پہلو کو چھیڑے بغیر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ جمہور علماء اسلام یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وقتی ضرورت کے تحت عارضی شادی متعہ کا اجرا فرمایا اور حیات پیغمبر میں اسپر عملدرآمد ہوتا رہا، حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی جاری رہا، البتہ حضرت عمر نے تقاضائے وقت کے تحت اس پر پابندی لگادی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے ولی امر کو وقتی حالات کے مطابق اس قسم کے معاملات میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس زمانے کے مسلمانوں نے انکی ممانعت کو ایک سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت سمجھ کر قبول کیا جیسے ناصرالدین قاچار (شاہ ایران) کے برطانوی کمپنی تمباکو کا معاہدہ کرنے کے موقع پر مرجع عصر آیۃ اللہ مرزا حسن شیرازیؒ نے تمباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ جاری فرمایا [2] اور ایرانی قوم نے اسے ایک سیاسی مصلحت و وقتی حکم تسلیم کرتے ہوئے اپنایا اور مصلحت پوری ہونے پر پھر حالت سابقہ پر عملدرآمد شروع ہوگیا۔

---

[1] الغدیر ج ۶ ص: ۲۱۳ [2] المنجد فی الاعلام "شیراز" ص: ۳۹۸

عارضی شادی (متعہ) کے بارے میں حضرت عمر کا امتناعی حکم بھی ایسا ہی ایک وقتی مصلحت پر مبنی اجتہادی اقدام تھا۔ جسے بعد میں مسلمانوں نے دائمی حکم بنا دیا، اس کے علاوہ علماء اسلام کو اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ رسول اللہ نے جس وقتی ضرورت کے تحت عارضی شادی (متعہ) کی اجازت دی تھی، وہی یا اس جیسی ضرورت مسلمانوں کو پھر درپیش ہو تو سیرت رسولؐ کی روشنی میں انھیں کیا موقف اپنانا ہوگا

اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین یا تین سے زاید طلاق دیدیتا ہے تو وہ "بائن طلاق" ہوتی ہے اور جب تک کوئی دوسرا شخص اس مطلقہ سے نکاح کر کے ایک رات کی ہمبستری کے بعد طلاق نہ دے، پہلا شوہر اس عورت کو دوبارہ اپنی زوجیت میں نہیں لا سکتا، اس کو "نکاح تحلیل" کہا جاتا ہے، علماء اسلام یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ صرف ایک رات کے لیے ہے، اسے جائز جانتے ہیں، تو پھر نکاح موقت (عارضی شادی) کے جواز میں پس و پیش کیا معنی ؟

فقہ جعفری کی رو سے "محللہ" کیلئے طلاق پانے کے بعد عدہ ضروری ہے، اس دوران شوہر ثانی کو رجوع کا حق ہے، شوہر اول یا کسی اور کو اس عدہ کے درمیان اس عورت سے عقد کرنا مجاز نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تاریخی دلچسپ واقعہ ہدیۂ ناظرین ہے :

سلطان شمس الدین کی بیٹی، سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے سلطان محمد سے بیاہی تھی، اسے ایک دن سلطان محمد نے مستی کے عالم میں تین طلاقیں

دے دیں، نشہ اترا تو پچھتایا، اس سے رجوع کرنا چاہا تو علمانے فتوی سنایا کہ جب تک وہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرکے اس سے ایک شب ہمبستر ہونیکے بعد طلاق نہ پائے تمہارے لیے حلال نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس نے اپنے پیر بھائی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے بیٹے شیخ صدرالدین سے عرض کیا کہ اس عورت سے نکاح کرکے "خلوت صحیحہ" کے بعد طلاق دے دیں تاکہ میں اس سے دوبارہ نکاح کرلوں، شیخ صدرالدین نکاح کے بعد خلوت خانہ میں پہنچے تو عورت نے عرض کیا کہ خدا کے لطف وکرم سے اس فاسق وفاجر سے نجات ملی، آپکے پہلو میں جگہ پائی، کیا آپ پھر مجھے اسکے حوالے کردیں گے؟ یہ بات کیا اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی؟ شیخ نے مسکراتے ہوئے فرمایا! اگر تم نہیں چاہتیں تو میں تمہیں طلاق نہ دوں گا، چنانچہ اگلے روز ان سے سلطان محمد نے طلاق کا سوال کیا تو انھوں نے سلطان کو دینے سے انکار کردیا، اس پر سلطان محمد بہت زچ ہوا، شیخ سے بدلہ لینے کی ٹھان لی، مگر سرحد پر مغلوں کے حملوں کی روک تھام میں مارا گیا۔"

۹۔ طبقات اکبری ص ۴۳۰ (نظام الدین ہروی) مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

طلاق

شادی کی طرح طلاق کا معاملہ بھی انسانی معاشرہ کا ایک اہم مسئلہ ہے، جو عورت کی ذات کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہوتا چلا آرہا ہے، آزادیٔ نسواں کی تحریک سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ نکاح ایک ناقابل تنسیخ مقدس معاہدہ ہے جو ایک بار ہو جانے کے بعد ختم نہیں کیا جا سکتا، اسے توڑنا گویا الٰہی قضا و قدر میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شادی کے مقدس معاہدہ کے ذریعہ مرد و عورت ایک دوسرے کے اتنے قریبی ہمراز اور دمساز ہو جاتے ہیں کہ کان لگا کر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سننے اور قلبی واردات و کیفیات کو محسوس کرنے لگتے ہیں، لیکن شادی محض جذبات کی تسکین کا نام نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس مقدس بندھن کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے عادات و اطوار، رنگ ڈھنگ میں یک رنگی اور ہم مزاجی کا سنگم ہوتا ہے تو زندگی کی کٹھن منزلیں بھی ہنستے مسکراتے طے ہو جاتی ہیں اور گھر کا ماحول میاں بیوی اور بچوں کے دم قدم سے جنت نشاں بنا رہتا، ہر شب شب برات اور ہر روز روز عید ہوتا ہے، مگر اس دنیائے رنگ و بو میں خوشبو و بدبو، خوش رنگی و بدرنگی، ہم آہنگی و بے ربطی غیر متوقع نہیں، چنانچہ شوئی قسمت سے

اگر میاں بیوی کا مزاج باہم مختلف ہو اور ایک دوسرے سے میل نہ کھائے تو اس کی خلیج سے یہ شادی، خانہ بربادی پر منتج ہوتی ہے، تاہم میاں بیوی اپنے اپنے اور ایک دوسرے کے مزاج کو سامنے رکھ کر حتی الامکان مفاہمت کی کوشش کریں، تاکہ بسا بسایا گھر نہ اجڑے اور صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بچوں کا مستقبل تاریک نہ ہو

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ شادی خانہ آبادی ہے تو طلاق خانہ بربادی طلاق کے بعد اولاد کی پرورش، تربیت ایک اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔ اس لیے مرد و عورت کو بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنے باہمی تعلقات، عادات و اطوار اور مزاجوں میں ہم آہنگی، مفاہمت اور نباہ کرنے کے امکانات پیدا کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے، طلاق کے بعد ممکن ہے مرد و عورت دوسری شادی کر کے ایک دوسرے کا نعم البدل پالیں، لیکن بچوں کے مستقبل پر مایوسیوں کے سایے منڈلانے لگتے ہیں، ان کے دل و دماغ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بسا اوقات یہ کشمکش انکی پوری کائنات حیات پر محیط ہو جاتی ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے ناخوشگوار حالات و اثرات معاشرے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، معلوم نہیں فرائیڈ کی تحلیل نفسی اس سلسلے میں کیا کہتی ہے، مگر اسلامی شریعت کا اسے "ابغض الحلال"[۵] کہنا یقیناً ایک لمحۂ فکریہ پیدا کرتا ہے۔

---

۵ کتاب الطلاق، وسائل الشیعہ۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ شے قرار دیتا ہے، مگر حرام نہیں سمجھتا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسکے علاوہ چارۂ کار نہ ہو اور طرفین کی بھلائی ایکدوسرے سے کنارہ کشی ہی میں منحصر ہو تو ایسی حالت میں پھر بہتر یہی ہے کہ آئے دن کی تو تو، میں میں سے چھٹکارا پا لیا جائے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شادی کا مقصد جذبات اور نفسانی خواہشوں کی تسکین ہی نہیں، افزائش نسل اور تشکیل خاندان بھی ہے، طلاق سے اسکا شیرازہ متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے اس سلسلے میں جوش اور جذبات کے بجائے ہوش و خرد اور ضبط و تحمل سے کام لینے کی سخت ضرورت ہے۔

عورت، مرد سے زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے، ممکن شریعت نے اسی لیے طلاق کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں دی ہے کہ اس سے دور اندیشی اور انجام بینی سے کام لینے کی زیادہ توقع ہے، اسے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ موجودہ بچوں کا کیا ہوگا! اگر بچے نہیں ہیں تو بھی دوسری شادی کرنے میں از سر نو مہر اور شادی کے دوسرے اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے اور یہ بسا بسایا گھر اجڑ جائیگا نیے سرے سے گھر کا دوبارہ آباد کرنا آسان نہیں، یہ گڈے گڑیا کا بیاہ نہیں، مرد اور عورت کی شادی کا

معاملہ ہے، جس میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری بیوی بھی ایسی ہی نکلی تو پھر کیا ہوگا! کیا معلوم کس کروٹ اونٹ بیٹھے، غرضیکہ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرد آسانی سے طلاق کی بات نہیں سوچتا، ادھر قرآن نے مرد کو مخاطب کرکے بعض نفسیاتی پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی دعوت دی چنانچہ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً [1]	انکے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو، اگر تم انکو ناپسند کرو تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمکو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔

عورتوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے دوسری جگہ اسی سورۂ نساء میں فرمایا گیا:

وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزاً او اعراضاً فلا جناح علیھما ان یصلحا بینھما صلحاً والصلح خیر، واحضرت الانفس الشح وان تحسنوا وتتقوا فان اللہ کان بما تعملون خبیراً [2]	اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اسمیں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کسی طرح صلح کرلیں صلح بہرحال بہتر ہے، نفس تنگدلی کیطرف جلد مایل ہوجاتے ہیں، اگر تم احسان سے پیش آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اگر میاں بیوی معاملہ کو آپس میں سلجھانے سے قاصر ہوں یا اپنی اپنی انا کا سوال ہو تو طرفین کے معاملہ فہم اور صلح جو لوگوں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ دونوں کو سمجھا بجھا کر آپس میں مصالحت کرادیں، چنانچہ اس سلسلے میں ان قرآنی ہدایات پر عمل پیرا ہونیکی ضرورت ہے:

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۹ [2] سورۂ نساء آیت ۱۲۸

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکماً من اھلہ وحکماً من اھلھا ان یریدا اصلاحاً یوفق اللہ بینھما ان اللہ کان علیماً خبیراً [1]

اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کا ڈر ہو تو ایک حکم مرد والوں کی طرف سے اور ایک عورت والوں کی طرف سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں تو اللہ انکے درمیان موافقت کرا دیگا، بیشک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

"فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ" حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، حکیم مطلق وحکیم ربانی کے پر از حکمت ومصلحت احکام اور تعلیمات انسانی زندگی کیلیے رہنما اصول ہیں، شادی کے سلسلے میں جو احادیث اور ہدایات ملتے ہیں، ان میں مختلف انداز سے شادی کی ترغیب دلائی گئی ہے، اسکے برخلاف طلاق کے بارے میں تہدید وتخویف کی آئینہ دار حدیثیں ملتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ طلاق خدا اور رسول کے نزدیک پسندیدہ امر نہیں ہے، اب ظاہر ہے کہ جو چیز پسندیدۂ خدا اور رسولؐ ہے اسے زیادہ سے زیادہ اپنانا ہر مسلمان کیلیے باعث فخر بات ہے اور جو ناپسندیدہ خدا اور رسولؐ ہے اس سے زیادہ سے زیادہ اجتناب وپرہیز لازم ہے، طلاق ایک ناپسندیدہ خدا اور رسول امر ہے تو اسکے لیے دین فطرت کی طرف سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہونا چاہیں کہ طلاق بہت کم وقوع پذیر ہو سکے، چنانچہ احکام طلاق کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت نے طلاق کے بارے میں جو حدود وقیود اور شرائط معین کیے ہیں

---

[1] سورۃ النساء آیت ۳۵

ان میں یہی فلسفہ کارفرما ہے، مثلاً غصہ میں صیغۂ طلاق کا جاری نہ کرنا، جبر واکراہ اور مدہوشی کے عالم نیز حالت حیض ونفاس میں طلاق کا واقع نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

غصہ میں آدمی بسا اوقات اندھا اور پاگل ہو جاتا ہے، اسے اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی اور وہ غلط اقدام کر بیٹھتا ہے، شرعی احکام عقل وشعور اور ہوش وخرد سے وابستہ ہیں تو پھر غصہ کے عالم میں جبکہ آدمی کا پارہ چڑھ جاتا ہے، اسکے ہوش وحواس بجا نہیں رہتے ہیں، اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق طلاق طلاق کہہ بیٹھے تو اسے قابل اعتنا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ غصہ میں کیے گیے اقدامات پر اکثر بعد کو نادم وپشیمان ہونا پڑتا ہے، غیظ وغضب میں آدمی کی قوت فیصلہ معطل اور بیکار ہو جاتی ہے، وہ اچھائی برائی، حق وباطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے، تو ایسی حالت میں دی گئی طلاق کیسے صحت وسلامتی عقل کی آئینہ دار ہو سکتی ہے؟

اسلام ببانگ دہل اعلان کرتا ہے "لا اکراہ فی الدین" (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہوتی) شادی بیاہ کی طرح طلاق بھی امور دین میں سے ہے، بالغ وعاقل لڑکے اور لڑکی کی مرضی کے خلاف والدین کو نہ شادی کرنے کا حق ہے اور نہ انکو زبردستی طلاق پر مجبور کرنے کا، اسی طرح نہ حالت مدہوشی میں مرد کی جانب سے

سلہ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۶

طلاق واقع ہوسکتی ہے اور نہ حالت حیض و نفاس میں عورت کو طلاق دی جاسکتی ہے، بیوی کو حالت طہر میں ہمبستری کیے بغیر طلاق دینا تو صحیح ہے، مگر حالت حیض و نفاس میں اور ہمبستری کے بعد بلا طہر کے طلاق صحیح نہیں ہے، آخر الذکر دونوں صورتوں میں شوہر کو حالت طہر کا انتظار کرنا ضروری ہے، اسکی دو مصلحتیں ہوسکتی ہیں۔

طبی اعتبار سے حیض و نفاس کے زمانہ میں عورت کی طبیعت میں انتشار، مزاج میں جھنجلاہٹ اور چڑچڑاپن ہوجاتا ہے، اس جھونک میں کوئی ایسی بات بھی سرزد ہوسکتی ہے جو شوہر کے مزاج کے خلاف ہو اور اسکے ردعمل میں شوہر طلاق دے بیٹھے، اس لیے شریعت نے طلاق کیلیے طہر کی شرط رکھ کر شوہر کیواسطے صیغۂ طلاق کے اجرا کیلیے طہر تک رکنا ضروری قرار دیا، اس دوران میں ممکن ہے بیوی کو اپنی غلطی کا احساس ہوجایے اور اسپر نادم ہو، یا شوہر کو اس وقتی افتاد طبع میں بیوی کی معذوری کا خیال آجایے تو یہ دونوں ایک دوسرے سے عذر و معذرت کرلیں گے اور طلاق کی نوبت نہ آپایے گی۔

حالت حیض میں مباشرت کرنا نفسیاتی و طبی نقطۂ نظر سے مضر ہے، اس دوران میں مرد و عورت کے جنسی تعلقات معطل رہتے ہیں جبکہ مرد و عورت کے یہی جنسی جذبات اور خواہشیں انکے مابین الفت و محبت کا رشتہ قایم کرتے ہیں، زمانۂ حیض میں مزاج کے چڑچڑے ہوجانے سے میاں بیوی کے درمیان کبھی کچھ تلخیاں اور

بدمزگیاں پیدا ہوجاتی ہیں تو وہ حالت طہر میں جنسی تعلقات دوبارہ قائم ہوجانے پر
پھر خود بخود رفع ہوجاتی ہیں اور حالات خوشگوار ہوجاتے ہیں

اگر طلاق سو فیصدی صحیح واقع ہو لیکن بعد کو دونوں نے اپنی اپنی جگہ
ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارا یہ اقدام ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا،
اب مناسب یہی ہے کہ الٹے پاؤں واپس ہوجائیں اور جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جائیں،
تو بڑی خوشی کی بات ہے، کوئی مضائقہ نہیں، عدہ کے دوران شوق سے رجوع کرسکتے ہیں،
دوبارہ نکاح کرنے کی بھی ضرورت نہیں، عدہ کی مدت میں حکم زوجیت باقی رہتا ہے،
اسی لیے اسکا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ برقرار رہتا ہے، لیکن عدہ کی مدت ختم ہونیکے بعد
نان ونفقہ بھی ختم ہوجاتا ہے اور یہ دونوں ایکدوسرے کیلیے کلیتاً نامحرم ہوجاتے ہیں۔
اب چاہے عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلے یا زندگی بھر یوں ہی مطلقہ بیٹھی رہے،
پہلے شوہر پر اس کے نان ونفقہ کی ہرگز کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی، زبردستی اسکے سر پر
یہ ذمہ داری لادنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو مرد اسے طلاق دیے بغیر یوں ہی لٹکائے رکھے گا یا
ہلاک کرکے چھٹکارا پانیکی کوشش کرے گا، یا پھر تجرد کی زندگی اپنانے پر مجبور ہوگا،
اس لیے کہ یہ آسان بات نہیں کہ ہر شخص دوہری دوہری شادی کا بار اٹھا سکے، نئی دلہن

بیاہ کے لائے، اسلئے نان ونفقہ کا کفیل ہو اور مطلقہ کو بھی گھر بیٹھے خرچہ پیش کرتا رہے، جبکہ اسے تعلقات بالکل منقطع ہو چکے ہیں، اگر عورت کی درخواست پر حکومت اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے بالا ہی بالا طلاق کا سرٹیفکیٹ جاری فرما دے اور مرد کے سر اسکا نان ونفقہ منڈھ دے تو پھر ہر عورت بات بات پر طلاق کی طلبگار بن کر نان ونفقہ (Maintence) کے نام پر مرد سے رقم اینٹھتی رہے گی اور بغیر شادی پہلو کسی اور کا گرم کرے گی اور یوں وہ کسی ایک کی بیوی بن کر رہنے کے بجائے ہرجائی داشتہ بننے کو ترجیح دے گی۔

طلاق کے بعد زندگی بھر یا بعد ثانی تک عورت کا نان ونفقہ مسلسل مرد کے ذمہ رکھنا غیر منطقی بات ہے، اس لیے کہ عدہ کے بعد مرد و عورت کا وہ باہمی ربط و ضبط اور معاہدہ ختم ہو جاتا ہے جو شادی کی بنیاد ہے اور جس کی وجہ سے عورت کے ضروریات کی ذمہ داری مرد پر عاید ہوتی ہے، تو اب اسکے بعد نان ونفقہ کے باقی رہنے کا کیا سوال ہے؟ عدۂ طلاق گزرنیکے بعد یہ مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ جس طرح شادی سے پہلے کسی اجنبی، بلکہ منگنی شدہ عورت کا نان ونفقہ مرد پر لازم نہیں ہوتا، اسی طرح عدت کے بعد مطلقہ کے ضروریات زندگی مرد کے ذمے قرار نہیں دیے جا سکتے۔ نیز مطلقہ سے دوبارہ شادی کیے بغیر جیسے مرد کو جنسی تعلقات قایم رکھنے کا کوئی جواز نہیں، ایسے ہی عورت کو بنام نان ونفقہ مرد سے رقم وصول کرنیکا کوئی حق نہیں۔

عورت کو ہرجائی بنانیکے لیے بعض لوگ اظہار ہمدردی کے طور پر
کہتے ہیں کہ طلاق پانیکے بعد عورت بیچاری بے سہارا ہو جاتی ہے، طلاق کے بعد بھی
اسکے نان ونفقہ کی ذمہ داری اسپر نہ رکھی جاے جو اسکا رفیق حیات رہ چکا ہے تو پھر اور کون
یہ بار کفالت اٹھایے گا، کیا مطلقہ ہونے پر وہ انسانی ہمدردی کی بھی مستحق نہیں رہتی؟

اس ہمدردی کے پس منظر میں "چور سے کہے چوری کر اور شاہ سے کہے جاگتا رہ"
کا معاملہ کارفرما ہے، کوئی ان سے پوچھے کہ یہ مطلقہ کی ہمدردی میں کیوں مگرمچھ کے آنسو
بہایے جا رہے ہیں؟ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کو شادی سے پہلے، شادی کے بعد اور
مطلقہ ہونیکی صورت میں بھی شرعی حدود میں رہتے ہوے معاشی جدوجہد کا حق حاصل ہے
وہ اپنی جایداد، آمدنی اور کمائی کی مالک ومختار ہے اور اس میں تصرف کا پورا پورا حق رکھتی ہے
تو پھر طلاق کے بعد بلاوجہ اسے مرد کا دست نگر یا احسان مند بنایے رکھنا نہ صرف اسکی انا کو
ٹھیس پہنچانا ہے، بلکہ اسکی خود مختارانہ معاشی جدوجہد کو شل اور مفلوج کرنیکے مترادف ہے،
یہ اور بات ہے کہ جب تک وہ بیوی رہتی ہے اسوقت تک حقوق زوجیت ادا کرنے کے
صلہ میں شوہر سے نان ونفقہ ملتا رہتا ہے، جو شوہر سے عملی تعاون کا ایک بدل یا نعم البدل ہے
مگر ترک تعلقات کے بعد ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا، تو اب

اس شخص سے نان ونفقہ وصولنا سراسر مفت خوری ہے، جس کا کوئی عقلی وشرعی جواز نہیں ہے۔

بیوی نادار ہو یا مالدار طلاق کے بعد شوہر اسکے مصارف کا قطعاً ذمہ دار نہیں رہتا، انسانی ہمدردی کے تحت وہ کچھ امداد کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، مگر اسکے لیے اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا، جہاں تک حسن سلوک کا تعلق ہے قرآن نہ صرف اسکی حمایت کرتا، بلکہ وہ مردوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے، چنانچہ قرآنی ہدایت ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النسآء کرھًا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اٰتیتموھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا [1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں کو زبردستی ورثہ میں لو اور نہ اسلیے روک رکھو کہ اسکا کچھ حصہ ان سے لے لو جو تمنے انھیں دیا ہے، بجز اسکے کہ وہ کھلی ہوئی بیحیائی کا ارتکاب کریں، ان کے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو، پھر اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسمیں بہت سی بھلائی رکھ دے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

واذا طلقتم النسآء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارًا لتعتدوا ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسہ۔ [2]

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کردو اور انھیں دکھ دینے کیلیے روک نہ رکھو اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔

---

[1] سورۃ النسآء آیت ۱۹ [2] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۱

اس سلسلے میں مزید ہدایات ہوتی ہیں :

وان طلقتموھن من قبل ان تمسوھن وقد فرضتم لھن فریضۃ فنصف ما فرضتم الا ان یعفون او یعفو الذی بیدہ عقدۃ النکاح و ان تعفوا اقرب للتقوی ولا تنسوا الفضل بینکم ان اللہ بما تعملون بصیر ۔ ؎۱

اور اگر تم انکو طلاق دیدو قبل اسکے کہ تمنے انکو چھوا ہو اور تم جو کچھ مہر مقرر کرنا تھا وہ مقرر کر چکے ہو تو جو مہر مقرر کیا اسکا آدھا (ادا کرنا) ہوگا۔ ہاں اگر وہ درگزریں (اور اس سے کم لیں) یا وہ جسکے ہاتھ میں نکاح کا سررشتہ ہے (یعنی شوہر) درگزر کرے (اور زیادہ دے تو ایسا کر سکتا ہے) اگر تم عفو و درگزر سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب بات ہوگی، آپس میں احسان کرنا نہ بھولو، بیشک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

جن عورتوں کو طلاق بائن دی جایے، ان تک کو نہ صرف یہ کہ مہر دیکر اسے واپس لینے کو ناجائز قرار دیا گیا، بلکہ مہر کے علاوہ مزید حسن سلوک اور احسان کے ساتھ رخصت کرنے کو کہا گیا، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے :

الطلاق مرتٰن فامساک بالمعروف او تسریح باحسان ۔ ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیئاً ۔ ؎۲

طلاق (رجعی) دو ہی مرتبہ ہے، اسکے بعد یا تو شریعت کے موافق روک ہی لینا چاہیے یا حسن سلوک سے (تیسری دفعہ) بالکل رخصت کردو اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم دیے ہوے مال (مہر) میں سے کچھ عورت سے واپس لے لو۔

بقول سعدی لطف و مہربانی اور حسن سلوک سے کشور دل جیت لیے جاتے ہیں اور دشمن دوست ہو جاتے ہیں ؎ آسایش دو گیتی، تفسیر ایں دو حرف است — بدوستاں تلطف، بدشمناں مدارا

؎۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۳۷ ؎۲ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹

دوستوں کی خاطر و مدارات الفت و دوستی کا تقاضہ ہے، اس سے جذبہ الفت و محبت استحکام پاتا ہے اور دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک ایک ایسا زبردست اخلاقی حربہ ہے جس سے بڑے سے بڑے دشمن زیر ہو جاتے ہیں، اگر اسکے بعد دشمن کے رویے میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی تو دنیا اسکو احسان فراموش قرار دیتی ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر سر تو جھکائے جا سکتے ہیں مگر دل نہیں جھکا کرتے، پتھر دل ہر و محبت اور حسن سلوک سے موم ہو جاتے ہیں بشرطیکہ قساوت و کفر کی مہر نہ لگی ہو۔

دنیا دیکھے کہ اسلام کی نظر میں عورت کا کس قدر احترام ہے، اسلام قدم قدم پر عورت کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے چنانچہ سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:

یا ایھا الذین امنوا اذا نکحتم المومنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھن من عدۃ تعتدونھا فمتعوھن و سرحوھن سراحا جمیلا [1]	اے ایمان لانیوالو! اگر تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انکو چھونے سے پہلے طلاق دیدو تو ان عورتوں پر عدت کا کوئی حکم نہیں جسے تم شمار کر سکو، پس انھیں کچھ مال دیکر عمدگی سے رخصت کر دو۔

اس مقام پر حسن اخلاق کے چند پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ مہر کے بغیر کوئی نکاح شریعت کی نظر میں قابل قبول نہیں، مگر

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت ۴۹

اسے بازاری عورت کی فیس کے مانند سمجھنا غلط ہے، اس لیے کہ اسکو چھونے سے پہلے کوئی فیس عاید نہیں ہوتی، مہر کی نوعیت اس سے مختلف ہے، وہ نکاح کے بعد چھونے سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں نصف اور جنسی تعلقات قائم ہونیکے بعد طلاق دیے جانے پر کل واجب ہوتا ہے، نیز زن بازاری کی محض فیس ادا کرنا ہوتی ہے، جبکہ منکوحہ کے مہر کے ساتھ ساتھ اسکے نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی لازمی ہے۔ اگر نکاح کی غرض وغایت محض جذبات کی تسکین اور جنسی تعلقات کا قیام ہے تو منکوحہ کو چھوئے بغیر طلاق دینے پر نصف مہر کی ادائیگی کا فلسفہ کیا ہے؟

۲۔ یہ بات ہرگز درست نہیں ہے کہ جس طرح مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے اسی طرح انسانی مساوات کے ناطے عورت کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے! متعدد مقامات پر یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ مرد اور عورت میں صنفی مغایرت ہونیکی وجہ سے ہر جگہ انمیں یکساں طور پر مساوات جاری وساری نہیں ہوسکتی، مطلق شادی مرد اور عورت کا بنیادی حق ہے، لیکن مرد کی طرح عورت بیک وقت متعدد شادیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی، اسی طرح عورت اپنی جذباتی فطرت کی بدولت طلاق کے معاملہ میں بھی محتاط رویہ نہیں اپنا سکتی، مرد کے مقابلہ میں عورت کا زیادہ جذباتی ہونا بدیہیات میں سے ہے اور یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ شادی کا مقصد

محض جذبات کی تسکین نہیں، بلکہ افزائش نسل تشکیل خاندان، اولاد کی پرورش وتربیت وغیرہ پر مشتمل ہے، جن ممالک میں شادی کا مطلب ومقصد محض جنسی عمل ہے اور مرد وعورت کو شادی وطلاق کا یکساں طور پر حق دیدیا گیا ہے، وہاں شادی سے زیادہ طلاق کا بازار گرم ہے اور جنسیات کا لاوہ اُبل رہا ہے، اسکے برخلاف اسلامی ممالک میں جہاں طلاق کا معاملہ مرد کے ہاتھ اختیار میں ہے، وہاں اسکی فتنہ سامانیاں حشر بداماں نظر نہیں آتیں۔

۳۔ اسلامی شادی میں مہر جزو لاینفک ہے، اگر اسلامی دنیا میں بھی طلاق کا معاملہ کلیتاً عورت کے سپرد کردیا جائے تو وہ آئے دن نئے نئے مردوں سے شادی رچاتی، مہر وصولتی اور طلاق دیتی رہے گی، کہیں اور کبھی بھی بس نہیں کریگی اور کسی ایک کی ہو کر نہیں رہے گی، اس لیے کہ رقمیں بٹورنے کا اس سے آسان اور عمدہ کوئی اور دھندہ نہیں ہوسکتا، یہ اور بات ہے کہ وہ خود زندگی بھر گم گشتہ منزل کیطرح یہاں وہاں، ادھر ادھر بھٹکتی رہے گی، اسے اپنی اولاد نہ ملیگی اور ملی بھی تو، لاوارث یتیموں کی طرح پرورش پائے گی، غالباً اسی لیے اسلامی شریعت نے طلاق کو ابغض حلال اور بہت زیادہ طلاقیں دینے اور نئی نئی شادیوں کے ذائقے چکھنے والوں کو ناپسند کیا ہے، چنانچہ معصوم کا ارشاد ہے:

عن ابی عبداللہؑ قال سمعت ابی	حضرت ابوعبداللہؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کو فرماتے سنا کہ

یقول ان اللہ عزوجل یبغض کل مطلاق وذواق*	اللہ تعالیٰ بہت طلاق دینے اور ذائقہ چکھنے والے کو ناپسند کرتا ہے۔

دوسری حدیث :

عن ابی عبداللہ ؑ قال: ما من شیٔ مما احلہ اللہ ابغض الیہ من الطلاق وان اللہ یبغض المطلاق الذواق*	حضرت ابوعبداللہ ؑ فرماتے ہیں کہ : حلال چیزوں میں سب سے زیادہ طلاق اور اسکا دینے اور ذائقہ چکھنے والا شخص اللہ کو ناپسند ہے۔

مہر کے بدلے عورت مرد کی ملک نکاح میں آتی ہے اور طرفین باہمی رضامندی سے مہر معین یا مہر بالمثل پر معاہدہ نکاح کرتے ہیں، مہر کی ادائیگی کے بغیر شوہر اپنی مرضی سے معاہدہ نکاح کو ختم نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح شوہر کو راضی کیے بغیر بیوی کو بھی طلاق کا حق نہیں، رضامندی خواہ مہر کی رقم بخش کر حاصل کی جائے یا کوئی اور قربانی دے کر۔ فقہی اصطلاح میں اسی کو "طلاق خلع" اور "طلاق مبارات" کہا جاتا ہے۔

شریعت نے مرد کو یقیناً یہ اختیار دیا ہے کہ وہ عورت کو ملکیت نکاح میں باقی رکھے یا ختم کردے، لیکن مرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ بیوی کے حقوق ادا کیے بغیر

---

* باب کراھۃ الطلاق، وسایل الشیعۃ۔

زبردستی اسے اپنی زوجیت میں رکھے رہے یا اسے اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ خلع لینے پر مجبور ہو جائے، ایسی صورت میں حاکم شرع کو حق پہنچتا ہے کہ مداخلت کرکے شوہر کے ظلم و تعدی سے عورت کو نجات دلادے۔ اسی طرح عورت شوہر کو ناپسند کرتی ہو اور اسے اس بات کا خیال ہو کہ شرعی اعتبار سے مجھ پر جو شوہر کے حقوق عاید ہوتے ہیں، انکی ادائیگی کیلیے میں اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں کر پاؤں گی، اسلیے شوہر سے طلاق لے لینا ہی مناسب ہے، اور شوہر کو کچھ لے دیکر طلاق کیلیے آمادہ کرلیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس طرح حاصل کی گئی طلاق بھی خلع یا مبارات ہی کے حکم میں آتی ہے۔

—:—

پردہ

پردہ کے حدود و قیود پر بحث کرنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ضرورت یا عدم ضرورت اور اسکی غرض و غایت پر غور کیا جائے۔

موجودات عالم پر غائرانہ نظر ڈال کر دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات رنگ و بو میں سب ہی چیزیں بے پردہ و بے نقاب ہیں اور نہ سب کی سب مستور و پنہاں۔ صرف انسانی وجود ہی کو لے لیجیے جس میں عالم اکبر سمایا ہوا ہے، اس میں سر سے پاؤں تک کچھ اعضا و جوارح کھلم کھلا نظر آتے ہیں تو بہت کچھ نگاہوں سے اوجھل اور پنہاں، جنکی صحت و بقا کیلیے کھلی فضا درکار ہے اور جنھیں اپنے طبیعی افعال انجام دینے کیلیے کھلے بندھن ہونا ضروری ہے انھیں جسم کی بیرونی سطح پر مناسب جگہ ملی، مگر ان پر بھی کھال کا دبیز غلاف چڑھا کر گوشت کو گرد و غبار اور بیکٹریا سے محفوظ کیا گیا اور جسم کے وہ اہم اجزا جو اعضائے رئیسہ کہلاتے ہیں اور پوری کائنات جسم کی فنا و بقا میں اہم رول ادا کرتے ہیں انمیں سے ہر ایک کو ہڈیوں کے محفوظ قلعوں کے حصار میں جگہ دی گئی۔

اس روشنی اور روشن خیالی کے دور میں کوئی ڈاکٹر یہ مشورہ دینے کی ہرگز جسارت نہیں کر سکتا اور نہ اسکا یہ مشورہ قابل قبول ہو سکتا ہے کہ دل کو سینہ کی پسلیوں کے محفوظ قلعے سے

نکال کر چھاتی کے اوپر لٹکا لیا جائے تاکہ دل کی حرکت اور اسکے عمل کو ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکے۔ اگر کوئی خبطی ایسا کر بیٹھے تو اسکا انجام اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ دل، دل نہ رہے بلکہ گوشت کے ایک لوتھڑے میں تبدیل ہو جائے۔ دل کی حرکت پر نبض کی رفتار اور نفس کی آمد و شد کا مدار ہے، اسے معمولی سی ٹھیس پہنچانا بھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے، اسلیے اسے پسلیوں کی محراب میں مکین کیا گیا، گویا جو چیز جتنی زیادہ اہمیت کی حامل ہے، اتنا ہی زیادہ قدرت نے اسکی حفاظت کا اہتمام کیا ہے۔ الغرض عالم کون و فساد اور کائنات رنگ و بو کی ہر ایک شے میں یہی انداز کارفرما ہے اور انسانی فطرت بھی اسی کی آئینہ دار ہے کہ جو چیز بیش قیمت ہو اسے چھپا کر حفاظت سے رکھا جائے اور جس شے کی کوئی قدر و قیمت نہیں وہ یوں ہی ٹھوکروں میں پڑی رہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شے کا پردہ اور حجاب میں ہونا درحقیقت اسکی عظمت و اہمیت کی علامت اور حفاظت و صیانت کی ضمانت ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو عورت کا وجود ایک کنز مخفی اور قدرت کے راز سربستہ کی حیثیت رکھتا ہے، خود لفظ "عورت" میں یہ حقیقت مضمر و پنہاں ہے۔ امانت دار فطرت اور راز دار قدرت انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ اسے سینے سے لگائے رہے اور اسکا پردہ فاش نہ کرے۔

انسانی تہذیب بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے صحن کائنات میں
نہ جانے کتنی تہذیبیں پلی بڑھیں، پروان چڑھیں اور دم توڑ گئیں، مگر تاریخ کے
صفحات پر ابھر کر سامنے آنیوالی دو ہی تہذیبیں ملتی ہیں ؛
جنسی عمل سے مکمل اجتناب یا جنسیات کا امڈتا سیلاب، انسانی کاروان حیات کیلیے
دونوں ہی تباہ کن ہیں، سابق امتوں کا حشر کسے معلوم نہیں، لیکن پارہ صفت انسانی مزاج
کسی ایک مقام پر ٹھہرنے کا عادی نہیں، بلکہ "کل یوم ھو فی شان" کا خواہاں رہتا ہے،
کبھی اسے نفس کشی اور خودکشی میں مزہ آتا ہے تو کبھی جنسی عمل حتیٰ کہ ہمجنس بازی میں
لذت محسوس ہوتی ہے، تاریخ اپنے کو دہراتی رہتی ہے، جو آج قدیم ہے وہ کل جدید تھا
اور جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائیگا، آئندہ یہی پھر پلٹ کر آئیگا تو جدید ہو جائیگا۔
یہ تہذیب جدید کوئی اچھوتی چیز نہیں، بلکہ شراب کہنہ بجام نو ہے، مگر شراب نئی ہو یا
پرانی، شراب بہرحال شراب ہے، جسکے متعلق مشہور ہے کہ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی ۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ عقل و ہوش اور صحت و تندرستی کی دشمن ہے تو پھر اسے منہ ہی
کیوں لگایا جائے ؟ شاید اسلیے کہ غم روزگار کا مارا انسان کبھی کبھی خودکشی کی

آغوش میں اماں چاہنے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نیم عریاں چست لباس، فطرت کے نقش و نگار، خدوخال اور نشیب و فراز کو جاذب نظر بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں اسے نظر بد نہ لگ جائے، شاید اسی لیے ذوق دید نے چلمن کی اوٹ لی ہے، یہ انسان کا ذوق خود نمائی ہے جو اسے برہنگی پر اکسا رہا ہے اور نیم عریاں لباس کی دھجیاں بنا رہا ہے، اب جدید ذوق جنوں پر تار لباس بھی بار ہے، وہ ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا ہے اور برہنہ ہی رہنا چاہتا ہے، مگر ہم اتنا پوچھنا چاہیں گے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونیوالا انسان آج ہی برہنہ پیدا ہو رہا ہے یا روز ازل سے ہی ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے؟

سب ہی جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے انسان برہنہ پیدا ہوتا چلا آ رہا ہے، اور ابد تک یوں ہی برہنہ پیدا ہوتا رہے گا تو پھر اسکے بدن پر یہ لباس کب، کیوں اور کیسے آگیا؟ نہ آسمان سے ٹپکا، نہ زمین سے نکلا اور نہ خود بخود زیب تن ہو گیا۔ یہ انسانی فطرت کی طلب اور حضرت انسان ہی کی ایجاد ہے۔ یہیں سے انسانی تاریخ و تہذیب دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے، دور برہنگی اور دور ستر پوشی۔

اب اسکا فیصلہ انسان خود کرے کہ ان دونوں میں ترقی کا دور کونسا ہے ؟ اگر انسان بدو فطرت سے ترقی یافتہ پیدا ہوا ہے تب تو یقیناً برہنگی اور ترقی توام لازم و ملزوم ہیں اور اگر برہنہ پیدا ہونیوالا انسان نرا جاہل پیدا ہوتا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے ، رفتہ رفتہ جب سے انسانی شعور بیدار ہوا اور علم و آگہی نے برہنگی کو لباس و پوشش بخشی اسوقت سے انسانی تہذیب ترقی کی مرہون منت ہوئی۔

ترقی نقطۂ آغاز سے آگے بڑھنے کا نام ہے ، نقطۂ آغاز کو بعینہٖ آگے گھسیٹنے کا نام ترقی نہیں ، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان ہمیشہ سے برہنہ پیدا ہوتا چلا آرہا ہے اور ہمیشہ برہنہ ہی پیدا ہوتا رہے گا ، مگر کیا روشن خیال دنیا اس پیدائشی برہنگی ہی کو اصلی و فطری انسانی تہذیب سمجھتی ہے اور اسکے فروغ کو انسانی ترقی جانتی ہے ! تو پھر بطن مادر سے پیدا ہونیوالا پہلا انسان جسقدر برہنگی اپنے ساتھ لایا تھا اسوقت سے آجتک کی روز افزوں ترقی اس پیدائشی برہنگی کو ایک انچ بھی آگے کیوں نہ بڑھا سکی ؟ حالانکہ انسانی تخلیق کے اس طولانی عرصہ میں پیدائشی برہنگی کو صدیوں پہلے ترقی تہذیب کے ہاتھوں پوست کندہ چلتی پھرتی لاشوں اور ڈھانچوں میں حلول کر لینا چاہیے تھا ، اسلیے کہ جسم کی

بیرونی سطح کو لاکھ کوششوں کے باوجود پیدائشی عریانی سے اور زیادہ عریاں نہیں کیا جاسکتا اور ترقی کا تقاضہ مزید عریانی چاہتا ہے، لہذا اسکے علاوہ چارۂ کار نہیں کہ عریانی کی سمتِ سفر ظاہر سے باطن کی طرف موڑ دی جائے، اسلیے کہ یہیں سے یہیں لباس بھی جسم کی بیرونی سطح پر یک گونہ ملمع کاری ہی ہے جو عریانی میں اضافہ کے بجائے کمی پیدا کرتا ہے، ہاں ایکسریز، ریڈیائی شعاعوں کے لباس سے یہ کام بخوبی انجام پاسکتا ہے جو فی الحال ممکن نہیں، بفرض محال انسانی منطق اور سائنس امر محال کو ممکن کے قالب میں ڈھالنے پر قادر بھی ہوجائے تو یہ ترقی معکوس ہی رہے گی۔

انسان نے لاشعوری حدوں سے گزر کر شعور کی وادی میں قدم رکھا تو جسم عریاں کو لباس پہنا کر حیوانیت اور حیوانیت میں حد فاصل قائم کی، زمانہ کے گرم و سرد سے متاثر ہو کر لباس ادلتا بدلتا رہا، جنت کے باسی انسان کو دنیا کا بن باس ملا تو گھاس پھوس اور پتوں سے بدن کو چھپایا، جنگلی جانوروں کی کھالوں سے ستر پوشی کی، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ستر پوشی کا جذبہ خود بخود انسان کے دل میں پیدا ہوا یا کسی غیر انسانی مخلوق نے اسے تلقین کیا؟

انسانی سائنس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کیڑوں مکوڑوں کے قالبوں سے گزرتی ہوئی بندر تک پہنچی اور کاٹ تراش کے بعد اس نے انسان کا روپ

لے لیا، مگر اسکے بعد نہ جانے کونسی سد سکندری حائل ہوگئی کہ زندگی کا سفر انسانی ذات پر آکر رک گیا اور ایٹمی دھماکوں سے بھی اسے اڑا کر انسان آگے نہ بڑھ سکا۔

انسانی سائنس آگے بڑھکر آیے اور بتایے کہ یہ ترقی پذیر خودکار زندگی کا سفر کیوں رک گیا؟ انسان کی ذات پر پہنچکر اسنے ڈیرے کیوں لگادیے؟ یہ خود کا برہنہ زندگی کے بدن پر لباس کہاں سے آیا؟ کسنے پہنایا اور کیوں پہنایا؟

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب شعور انسانی بالغ ہوا، احساسات جاگے، جذبات نے انگڑائی لی، خودنمائی نے اپنے سراپا کو دیکھا تو ستر پوشی کا خیال آیا عقل اور فطرت نے لباس اختراع کیا اور انسان کو ستر پوش بنایا، برہنہ پیدا ہونے اور برہنہ رہنے کے بعد انسان کے دل میں خود بخود یہ ستر پوشی کا جذبہ اور ذہن میں اسکا خیال پیدا ہونا بتاتا ہے کہ ستر پوشی فطرت کی طلب اور عقل کا تقاضہ ہے۔

انسانی زندگی کی تصویر دو ہی رخ پیش کرتی ہے: برہنہ اور پردہ پوش، برہنگی نقش اول ہے تو پردہ داری نقش ثانی، زندگی کا پہلا قدم عریانی ہے تو دوسرا پردہ داری، مانا کہ اولیت عریانی کو حاصل ہے، مگر اولویت پردہ داری نے پائی ستر پوشی حیوانیت و انسانیت کے مابین حد فاصل بھی ہے اور مابہ الامتیاز بھی، اسی سے

انسانیت کا بھرم قایم ہوا اور اسی سے اسکا پرچم بلند ہوا۔ یہ انسانی عقل کی دین بھی ہے اور انسانیت کے لیے خلعت وانعام بھی، انسان نے حیوانی و انسانی مشترکہ پیدائشی عریانی سے ہٹ کر جو پردہ پوشی کی امتیازی شان اپنائی، یہی اسکی اپنی انسانیت کی انفرادی علامت ہے اور ترقی و پیشقدمی کا اعزازی نشان بھی۔ اب جو تہذیب عریانی کی آئینہ دار ہے وہ درحقیقت جہالت و بربریت اور تنزل و حیوانیت کی ترجمان ہے اور جو تہذیب پردہ کی حامل و حامی ہے وہ علم و آگہی اور انسانی تمدن کے فروغ و ارتقا کی علمبردار ہے۔ ارباب عقل و دانش کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ پردہ عقل و شعور کی ترقی کی علامت ہے جہالت کی نہیں، اب ترقی پسندی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان پردہ دار بنے اور بے پردگی اختیار نہ کرے، چنانچہ جو مذہب یا فرد جتنا پردہ دار ہے اتنا ہی وہ ترقی پسند ہے، یا یوں کہیے کہ جو جتنا ترقی پسند بننا چاہتا ہے اسکو اتنا ہی پردہ دار ہونا چاہیے۔

اسلام عقل و شعور کی اپیل کو قبول کرتا ہے اور خود بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، منجملہ دیگر امور کے پردہ بھی اسلامی احکام میں خصوصی مقام رکھتا ہے، اسلیے کہ یہ عقل و شعور کی دین بھی ہے اور اسکا تقاضہ بھی۔ ستر عورتیں مرد و عورت دونوں کیلیے ضروری ہے لیکن عورت کے جسم کے پیچ و خم اور نشیب و فراز مقناطیسی کشش رکھتے ہیں، اسلیے عورت کو پورے جسم کے ڈھانکنے کی تلقین کی گئی، البتہ چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھوں کا

کھلا رکھنا عقل عمومی کے نزدیک غیر مناسب بات نہیں، اسلیے کہ راستہ چلنے اور کام کاج کرنے میں ایسا ہونا یقینی ہے، شاید اسی لیے بہت سے فقہاء و مجتہدین نے نماز کے علاوہ دیگر عام حالات میں بھی چہرہ اور دونوں پہنچوں کا ڈھانکنا ضروری نہیں قرار دیا ہے۔

عورت گھر کی ملکہ ہے، گھر کا نظم و نسق، انتظام و انصرام، بچوں کی نگرانی اور پرورش و تربیت اسکے حسن تدبیر پر موقوف ہے، لہذا عورت کی تمام تر توجہ اسکے اپنے گھر بار، بال بچوں پر مرکوز ہونا ضروری ہے، اسی لیے اسکے اور اولاد کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مرد کے سر ہے، مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ عورت معاشرہ سے بے نیاز اور غافل ہو کر خانہ نشینی اختیار کرلے اور گھر سے باہر جھانک کر نہ دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے، نہیں، وقت پڑنے پر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور انھیں پانی پلانے کیلیے میدان جنگ تک میں جا سکتی ہے، دور دراز کا سفر طے کرکے فریضۂ حج کی ادائیگی اسپر بھی ویسے ہی لازم ہے جیسے مرد پر، نماز جماعت پڑھنے کا اسے بھی حق حاصل ہے، لیکن شریعت نے اسکے صنفی تشخص اور وقار کا ہر جگہ پاس و لحاظ رکھا ہے، نماز جماعت میں مرد اور عورت کو ایکدوسرے کے پہلو میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں، عورتوں کی صف پیچھے رکھی گئی ہے مردوں کی صفیں آگے، گویا مردوں کو عورتوں کا سینہ سپر قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کو مردوں کا پشت پناہ۔

یہاں یہ بات ناقابل فراموش ہے کہ شریعت عبادت کے مقدس ومحترم اجتماع میں مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط پسند نہیں کرتی، اسلام نباض فطرت انسانی ہے وہ جانتا ہے کہ مرد اور عورت ایکدوسرے کا پہلو دبائیں گے تو دل کی دھڑکنیں خود بخود تیز ہو جائیں گی، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھیں گے اور مقدس ماحول وفضا تکدر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مذاہب میں مرد وعورت کے جنسی تعلقات کو روحانیت کے منافی قرار دیا گیا ہے اور تجرد کی زندگی کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہاں بھی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط سے عبادت گاہوں کی فضا گندی وناپاک ہوئے بغیر نہ رہ سکی، ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن ازدواجی زندگی کو روح کی تکمیل میں مانع ومزاحم سمجھتے تھے، ہندوستان میں مردوں کی طرح عورتوں کی بھی بہت سی مذہبی برادریاں قایم تھیں، یہاں غیر شادی شدہ عورتیں آزادی کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہو سکتی تھیں، جہاں انھیں بقاعدہ رکن کی حیثیت دی جاتی تھی، غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کے اس اختلاط سے خانقاہوں کی فضا بالکل ناپاک ہو گئی تھی اور زناکاری عام تھی۔[1]

عیسائیت بھی رہبانیت پسندی میں ہندومت کے قریب رہی، قرون وسطیٰ میں شادی اور خاندانی تعلقات گناہ قرار پائے، گھر ویران اور خانقاہیں آباد ہونے لگیں، کنواری مریم اور کنوارے مسیح کی تقلید اتنی عام ہوئی کہ عورتیں راہبہ اور جوگی بننا فخر سمجھتی تھیں اور عمریں

---

[1] اسلام اور مذاہب عالم (مظہر الدین صدیقی)
ص: ۲۴۳

پادریوں اور کلیساؤں کی خدمت میں گزار دیتی تھیں، لیکن اس غیر فطری روش کا انجام یہ ہوا کہ عیسائیت غلط راستہ پر پڑ گئی، جس کے نتیجے میں غیر انسانی طریقے اختیار کیے گئے، کلیسا عیاشیوں کے خفیہ مرکز بن گئے اور تمام انگلستان چیخ اٹھا کہ ملک میں ایک لاکھ عورتیں ایسی ہیں جنھیں پادری خراب کر چکے ہیں اور اسی بنا پر عوام اور حکومت انگلستان نے ان خانقاہوں کو جو رہبانیت کا مرکز تھیں بند کرنے کا قصد کر لیا۔ [۹]

ہندومت اور عیسائیت دونوں عریانی اور بے پردگی کے بجائے روایتی پردہ کے حامل ہیں، لیکن اسکے باوجود خانقاہوں اور گرجاؤں میں تشویشناک انارکی کا پیدا ہونا بتاتا ہے کہ روایتی پردہ بھی جنسی بے راہ روی کو اسوقت تک نہیں روک سکتا جبتک مرد و عورت کے باہمی اختلاط کے مواقع پر کنٹرول نہ کیا جائے، اسی لیے شریعت اسلام نے جنسی محرکات اور دواعی کو مختلف انداز میں قابو میں رکھنے کے لیے اقدامات اور احکام مرتب کیے ہیں۔

اسلام عورت کو متاع بیش بہا جانتا ہے، عورت خود بھی صاحب عقل و شعور ہے اس لیے اسے اپنی قدر و قیمت کا خود ہی احساس ہونا چاہیے، اسلام نے عورت کو قرآن کی طرح مقدس و محترم قرار دیتے ہوئے پردہ کے غلاف و جزدان میں لپیٹ کر

---

[۹] اسلام اور مذاہب عالم (مظہر الدین صدیقی)
ص ۲۴۱

گرد و غبار سے بچے رہنے کا انتظام کیا اور بتایا کہ عورتیں وقت ضرورت گھر سے باہر نکلیں تو اپنی نگاہیں نیچی کر کے چلیں تاکہ نہ ٹھوکر کھائیں اور نہ نامحرموں سے آنکھیں چار ہوں، آنکھیں بند ہوں تو راستہ کیسے دیکھیں، شوق سے آنکھیں کھول کر چلیں اور زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھیں، گرد و پیش کا جائزہ لیں، مگر نگاہیں نیچی رہیں تاکہ کسی سے نظریں ٹکرائیں، نہ قلبی واردات رونما ہو، نہ آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوں اور نہ پیام و سلام کی نوبت آئے۔ اسکے علاوہ اپنی زینت و آرائش اور بناؤ سنگار اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور پر ظاہر نہ کریں، اسلیے کہ گھر سے باہر اپنے حسن و جمال اور زیب و زینت کی نمائش کا مقصد کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ یہ شان دلربائی دکھا کر اوروں کو اپنا شیدائی بنایا جائے تو جس طرح عورت کیلیے عریانی تباہ کن ہے اسی طرح زیب و زینت کی نمائش بھی فتنہ بردوش ہے اسی لیے قرآن نے اس بارے میں روک ٹوک کی ہے:

وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن	اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں
ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن	اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کو
الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن	ظاہر نہ کریں مگر وہ جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیوں کو
علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن	اپنے سینوں پر ڈالے رہیں اور اپنے شوہروں یا اپنے باپ دادوں
الا لبعولتھن او اٰبائھن او	یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہروں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں
اٰباء بعولتھن او اخوانھن او	یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی جیسی عورتوں

بنی اخوانھن او نسائھن او
ما ملکت ایمانھن او التابعین
غیر اولی الاربۃ من الرجال
او الطفل الذین لم یظھروا
علی عورات النساء ۔ ولا یضربن
بارجلھن لیعلم ما یخفین
من زینتھن ۔ [1]

یا اپنی لونڈیوں یا غلاموں، نوکروں سے جو
مرد صورت ہیں، مگر عورتوں سے کچھ مطلب
نہیں رکھتے یا وہ کمسن لڑکے جو عورتوں کے
پردے کی بات سے آگاہ نہیں ہیں، انکے سوا
کسی پر اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ ہونے دیا کریں
اور چلنے میں اپنے پاؤں زمین پر اسطرح نہ رکھیں کہ
لوگوں کو انکے پوشیدہ بناؤ سنگار (زیوروں کی جھنکار) کی خبر ہو جائے۔

راستہ چلتے وقت نگاہیں نیچی کیے رکھنے کا حکم صرف عورتوں ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ مردوں کو بھی نظر بازی سے باز رکھا گیا ہے اور عورتوں سے پہلے قرآن میں مردوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے:

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم
ویحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم
ان اللہ خبیر بما یصنعون ۔

اے رسولؐ ایمانداروں سے کہہ دو کہ اپنی نظروں کو
نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہی
انکے واسطے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے، یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں
خدا اس سے یقیناً خوب واقف ہے۔

---

[1] سورۃ النور آیت ۳۱

یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب عورتیں کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر اس انداز میں نکلیں گی کہ انکا بناؤ سنگار چادر، پردہ میں ڈھکا ہوا ہو اور نگاہیں نیچی ہوں تو بے بلاوجہ کی زحمت ہی کیوں کی جائیگی اور چلنے میں قدم ایسے محتاط اٹھیں کہ پایل کی جھنکار سے دل کے تار نہ جھنجھنائیں تو خوابیدہ جذبات بھی بیدار نہ ہوں گے، نہ راہ چلتے چور اچکوں کے کان کھڑے ہوں گے، نہ کسی کی زیوروں پر نگاہ پڑے گی اور نہ چھینا جھپٹی کی وارداتیں رونما ہوں گی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورتوں کیلئے زیب و زینت ممنوع ہے، نہیں ہرگز نہیں، مناسب آرائش و زیبائش لباس تو مردوں کیلئے بھی مباح ہے، چہ جائیکہ عورتیں مگر عورتوں کی آرائش و زیبائش اپنے محرموں کے حلقہ تک محدود رہتی تو شرم و حیا کا جامہ لیے ہوتی ہے اور جب آرائش جمال و نمائش حسن یاران نکتہ داں کو صلائے عام اور دعوت نظارہ دے رہی ہوتی تو خوابیدہ دلوں میں بھی برقی رو دوڑنے لگتی ہے، تہذیب جدید نے مرد کی زبانی عورت کو یہ باور کرایا کہ اس کا حسن و جمال، شباب کی رعنائیاں زیادہ سے زیادہ لطف اندوزیوں اور شاد کامیوں کیلئے ہے اور یہ ہر ایک مرد و زن کا فطری حق ہے۔

صنف مقابل سے حجاب غیر فطری ہے، عورت کی عریانی سے مرد کو یک گونہ لذت حاصل ہوتی ہے، وہ اس لذت اندوزی سے محروم ہونا نہیں چاہتا، اسی لیے وہ عورت کیلئے لباس بھی ایسا چاہتا ہے جو عورت کے جسم کی خوبیوں کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کرکے پرکشش بنادے، جس سے خوابیدہ جذبات بھی جاگ اٹھیں، فردوس نظارہ نکھر جائے

یہی وجہ ہے کہ ٹھٹرتی ہوئی فضاؤں اور یخ بستہ ہواؤں میں مرد خود تو سر سے پاؤں تک دبیز اونی لباس میں ملبوس رہتا ہے اور عورت کو نیم عریاں حالت میں برف پوش وادیوں اور کوچہ و بازار میں لیے گھومتا ہے، یہ تضاد عمل دیکھ کر بھی عورت کو نہ مرد کی سرد مہری کا احساس ہوتا ہے اور نہ عدم مساوات کے برتاؤ پر احتجاج کا دھیان آتا ہے،

حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال کو دیکھنے میں زنان مصر ایسی محو ہوئیں کہ ترنج کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور انھیں انگلیاں کٹنے کا احساس تک نہ ہوا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عصر جدید میں آزادیٔ خیال نے عورتوں کی قوت احساس کو ایسا سن کر دیا ہے کہ انھیں ذلت و عزت اور توقیر و توہین کسی بات کی کچھ خبر نہیں ہے۔

موسیقی

آواز کا کریہہ اور سریلا ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے۔ مختلف سُر اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ اثرات کے حامل ہیں۔ عصر حاضر میں آواز کے اثر سے زراعت کو بارآور بنانے کی تیاری کی جارہی ہے، چنانچہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں ایک خبر شایع ہوئی جسکی سرخی تھی :

پودے موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں،
مرد کی بہ نسبت عورت کی آواز کے زیادہ شایق
ہوتے ہیں۔

پودے موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں اور مرد کے
مقابلے میں عورت کی آواز زیادہ پسند کرتے ہیں۔

یہ دعویٰ اناملی یونیورسٹی شعبۂ نباتات کے ہیڈ پروفیسر ٹی ہی، این سنگھ کا ہے ..... اسکے بعد انھوں نے اپنی کاوشیں اور تجربات پیش کیے ہیں ..... پھر کہتے ہیں کہ میں نے مرد کی آواز کا تجربہ کیا، کوئی اثر نہیں دکھائی دیا، تب عورت کے گانے کا تجربہ کیا اور پتوں نے فوراً اسکا اثر قبول کیا ..... کرم کلّے اور گنّے کے کھیتوں میں سیکروفوں

لگاکر فصلوں کو برابر وقفے سے موسیقی سنائی گئی ۔۔۔۔ انھوں نے کہا کہ:
موسیقی کے بھی حدود ہیں، بعض راگ بعض پودوں کو مرجھا دیتے ہیں، میرا تجربہ ہے کہ مریخ کا پودا شام والے راگوں سے مرجھا جاتا ہے۔ اگر پودوں کو ضرورت سے زیادہ موسیقی سنائی جائے تو وہ تھک جاتے ہیں۔ [1]

اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی آواز پودوں تک پر اثر انداز ہوتی ہے تو اپنے پہلو میں حساس دل رکھنے والے ذی شعور مرد کے دل کی دنیا عورت کی آواز کے زیر و بم سے زیر و زبر ہو جائے تو کیا تعجب کی بات ہے، چنانچہ وہ موسیقی جو سفلی جذبات کو برانگیختہ کرے شریعت اسلام نے اسپر روک لگائی اور وہ موسیقی جو انسانی فضایل کو فروغ بخشنے کی محرک ہو اسے سند قبولیت بخشی ہے۔
اب تو یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو گئی کہ محض موسیقی کی آواز ہی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ فضا میں پیدا ہونیوالی ہر آواز انسانی اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے، چنانچہ:

فرانس کا مشہور و معروف انجینیر کامی روجرون جو دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے فرانسیسی بحریہ کے عظیم جنگی جہازوں "ریشیو" اور "جان بار" کی تیاری کا نگراں تھا

---

[1] روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ ص: ۶ ۲۳ جنوری ۱۹۵۶ء

کچھ دنوں سے آواز کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ انسانی جسم کے خلیوں پر آواز کا وہی اثر ہوتا ہے جو لوہے میں آکسیجن کا، جس طرح آکسیجن لوہے کو بتدریج زنگ آلود کر کے ختم کر دیتی ہے اسی طرح دائمی آواز بدن کے خلیوں اور ریشوں کو فرسودہ کر کے قلت عمر کا باعث ہوتی ہے

یہی انجینیر کہتا ہے کہ: شہر کے اندر ایک اچھا گھر وہ ہے جو مانع صدا (آواز کو روکنے والے) مصالحوں کے ذریعے اسطرح سے تیار کیا جائے کہ کسی قسم کی آواز باہر سے گھر کے اندر نہ پہنچے بشرطیکہ مکان کے اندر بھی ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی گرام اور ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی آواز اہل خانہ کے سکون و آرام میں مخل نہ ہو"

اس شخص کے نظریے کی بنا پر دائمی آواز کے نقصان دہ اثرات میں سے ایک ناگہانی جنون اور پاگل پن بھی ہے۔ مسلسل آواز رفتہ رفتہ اعصاب کو فرسودہ کر دیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نرم مزاج اور بردبار اشخاص جو ایک عمر نرمی اور متانت کے ساتھ بسر کر چکے ہیں، اچانک جنون اور پاگل پن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دائمی آواز کا ایک قطعی اور لازمی اثر یہ ہے کہ ہمیشہ ایک خستگی طاری رہتی ہے۔ جس سے لوگوں میں بے حوصلگی، کج خلقی اور بلاوجہ کدورت و بے لطفی پیدا ہوتی ہے، وہ لوگ جو لاشعوری طور پر ان اثرات و نتائج میں گرفتار ہوتے ہیں، اپنی سستی اور کسل مندی کے سبب سے

بے خبر ہوتے ہیں اور جب کسی طبیب، ڈاکٹر کے پاس جا کے معاینہ کراتے ہیں تو انکے جسم کے اعضائے رئیسہ میں کسی قسم کی کمی یا نقص نظر نہیں آتا۔

کامی روجرون کا عقیدہ ہے کہ دائمی آواز علاوہ اسکے کہ انسان کو خستہ، اداس اور بے حوصلہ بناتی ہے (اشخاص کے باہمی تفاوت کے ساتھ) پانچ سے دس سال تک آدمی کی عمر بھی گھٹا دیتی ہے، اگر آدمی کے پاس وسیلہ و ذریعہ ہو تو اسکو شہروں کے اندر مستقل آوازوں کے ماحول میں زندگی نہ گزارنا چاہیے۔

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلسل آواز خواہ وہ رسیلے نغمہ و سرود ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو انسانی ذہن و اعصاب پر مضر اثرات ڈالتی ہے، چنانچہ وہ موسیقار اور گانے باجے کے شوقین حضرات جن کا یہی اوڑھنا بچھونا ہے اپنے اوپر رحم کھائیں اور اپنے ذہن و اعصاب کی خیر منائیں۔

بعض چیزیں بنیادی طور پر مباح ہوتی ہیں، مگر ان کا محل استعمال انھیں مستحب و واجب، جائز و حلال یا مکروہ و حرام بنا دیتا ہے، چاقو، چھری سے پھل، سبزی کاٹنا، قلم پنسل بنانا جائز و مباح، حفاظت خود اختیاری کیلیے اسکا رکھنا ناگزیر ہو تو واجب اور وقت ضرورت استعمال بھی لازم و واجب۔ مگر کسی کی جیب کاٹنا، یا ناحق کسی کے پیٹ میں اسے بھونکنا سراسر ناجائز و حرام ہوگا۔

ماچس کا کام جلنا، جلانا اور آگ لگانا ہے، مگر خود بخود نہیں کسی کے ہاتھ کی جنبش اور رگڑ سے، اب اگر کوئی اس سے مسجد و امامباڑہ، مقامات مقدسہ پر شمع، چراغ روشن کرے، اگر بتی جلایے تو یہ نیک اور ثواب کا کام ہے شریعت کی نظر میں جزاک اللہ خیر الجزاء کی دعا کا مستحق ہے، لیکن اگر کوئی اس ماچس سے کسی غریب کے جھونپڑے اور چھپر میں آگ لگا دے، کسی کا مکان جلا ڈالے تو کون اس حرکت کو برا نہ کہے گا، مگر اس میں نہ ماچس کا قصور، نہ ماچس بنانے والے کا۔ ماچس بنانے والے نے ماچس بنائی صرف آگ کیلیے، ماچس کا کام کسی کے ہاتھوں صرف جلنا اور جلانا ہے کہاں جلائی جایے، کہاں نہ جلائی جایے یہ دیکھنا صاحب عقل و شعور انسان کا کام ہے اب جس فاعل مختار انسان کا یہ اختیاری فعل ہوگا وہی استعمال کے موقع و محل کے اعتبار سے جزا و سزا کا مستحق ہوگا۔ اسی طرح ریڈیو، موسیقی اور سینما کے معاملہ میں ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ریڈیو:

ریڈیو کا کام محض پروگرام نشر کرنا ہے۔ پروگرام بنانا، مرتب کرنا یہ ریڈیو کے عملے کا کام ہے، اب اگر ریڈیو پر خبریں، حسن اخلاق، اچھے کردار، سماجی سدھار، انفرادی، اجتماعی حقوق و فرائض، اقتصادی و عمرانی مسائل تعلیم و تربیت

سائنسی تحقیقات وایجادات اور انسانی فلاح وبہبود کے پروگرام نشر کیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ ریڈیو کا صحیح وجائز استعمال ہوگا بلکہ انسانی معاشرہ کیلیے قابل قدر خدمات ہوں گے اور ریڈیو رکھنا، اس کے پروگرام سننا ایک قابل رشک ماحول پیدا کرنے کا موجب ہوگا، اسکے برخلاف گمراہ کن، مخرب اخلاق پروگرام کی نہ نشر واشاعت جائز ہے اور نہ اسکا سننا جائز، بلکہ ایسے پروگرام کے جو بُرے اثرات اور غلط نتائج برآمد ہوں گے اسکی ذمہ داری بھی پروگرام تشکیل دینے والے اور ناشر پر عاید ہوگی۔

ٹیپ ریکارڈ:

ریڈیو سے ملتی جلتی نوعیت ٹیپ ریکارڈ کی ہے بلکہ اس میں یہ خوبی اور ہے کہ اسکی ریل پر بولنے والے کی آواز ٹیپ ہوکر محفوظ ہوجاتی ہے اور بار بار تقریر وگفتگو کے پروگرام کو دہرایا اور ریلے کیا جاسکتا ہے، سنی ہوئی عبارات ذہن سے محو ہوجانے پر پھر ذہن نشین کرائی جاسکتی ہے اور صاحب آواز کی آواز، اسکے لب ولہجہ کو اسکے مرنیکے بعد سنا جاسکتا ہے، اسکے استعمال کا جائز وناجائز ہونا بھی، پروگرام کی نوعیت پر موقوف ہے۔

ٹیلیویژن اور سینما:

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ کی طرح انسانی معاشرے کے سدھار اور

لگاڑیں ٹیلیویژن اور سینما کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ میں جو چیز کانوں سے سنی جاتی ہے، ٹیلیویژن اور سینما کے پردے پر اسکا پورا مرقع نظر آتا ہے اور "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" کے دواعی اپنی ساری کرشمہ سازیوں سمیت موجود و رقصاں ہوتے ہیں، اسلیے اس پر پیش کیے جانیوالے پروگراموں کا ہمہ جہتی طور پر جائزہ لینا چاہیے، اگر فواحش و منکرات کی عکاسی اور مخرب اخلاق چیزیں ہی ان کے معمولات بن جائیں تو یہ پورے معاشرے میں زہر گھولنے کا ذریعہ بنکر حرام و ناجائز ہوجاتے ہیں اور اگر ان سے پاک و پاکیزہ اور صالح معاشرہ تشکیل دینے کا کام لیا جایے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جایے تو اسکے مباح و جائز ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ کیا جائیگا۔ تعلیمی پروگرام جغرافیائی حالات، سائنسی معلومات، ٹیکنالوجی، سول ڈیفنس، باغبانی زراعت، حفظان صحت اور انسانی فلاح و بہبود کے پروگرام ٹیلیویژن اور سینما میں پیش کرکے کارآمد خدمات انجام دیے جاسکتے ہیں۔

-:-

ضبط تولید (برتھ کنٹرول)

اور اسقاط حمل

خداوند عالم نے کائنات انسان کیلیے پیدا کی ہے اور انسان کو اپنے لیے خلق فرمایا ہے، جس وقت تک کائنات باقی ہے انسانی نسل کا تسلسل قایم رہنا ناگزیر ہے اگر ضبط تولید اور اسقاط حمل کو عمومی حیثیت دیدی جائے تو ایک وقت ایسا آجائیگا جب شرح پیدائش صفر ہوجائیگی اور نسل انسانی کا سلسلہ قبل از وقت منقطع ہوجائیگا، نہ مکمل ضبط تولید از روئے عقل صحیح ہے، نہ بیش در بیش افزائش نسل ہی زندگی کا نصب العین قرار پاسکتا ہے، انسان بہرحال انسان ہے حشرات الارض میں سے نہیں، کہ انگنت اولاد پیدا کرکے یوں ہی چھوڑ دی جائے اور اور اسکی تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔

اولاد کو پیدا ہونیکے بعد مفلسی کے خوف سے مار ڈالنا تو صریحی طور پر عمداً قتل نفس ہے ہی، استقرار حمل کے بعد خواہ وہ نطفہ ہی کی حالت میں کیوں نہ ہو اسقاط حمل کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ ہاں وقوع حمل سے پہلے مانع حمل چیز کا استعمال جائز ہے، چنانچہ آیۃ اللہ العظمیٰ آقای الخوئی فرماتے ہیں:

عورت کیلیے ایسی مانع حمل چیز کا استعمال جائز ہے جو زیادہ نقصان دہ نہ ہو، خواہ اسکا شوہر اس چیز کے استعمال پر راضی نہ بھی ہو، لیکن اسکے لیے "اسقاط حمل" جائز نہیں خواہ وہ نطفے کی حالت میں ہی ہو، اگر عورت کی ہلاکت کا خوف ہو اور اسقاط نطفہ کی منزل میں کیا جائے تو بھی دیت بہرحال دینا ہوگی اور وہ اسکے ذمہ ہوگی جسنے اسقاط کا کام انجام دیا ہے، ہاں کفارہ بہرصورت واجب نہیں ہے۔

مصنوعی ذریعہ تولید

بقائے نسل ایک فطری تقاضہ ہے مگر جسطرح انسان اور حیوان کے مابین شکل وصورت اور نوعی اختلاف کے علاوہ غور وفکر، عقل وتدبر اور فہم وادراک کا فرق پایا جاتا ہے، اسی طرح بقائے نسل کے نوعی تقاضوں اور طریقوں کو بروئے کار لانے کیلیے کچھ امتیازی خطوط نیز خاندان کی تشکیل اور اسکی تعیین وتشخیص کیلیے کچھ حدود وقیود بھی ناگزیر ہیں، چنانچہ اسلام نے شادی بیاہ اور ازدواجی زندگی کیلیے جو ہدایات کیے ہیں اور جنسی اباحیت پسندی کے بجائے محرم ونامحرم کے حدود وقیود معین کیے ہیں وہ نہ صرف خاندان کی تشکیل وتعیین اور تشخیص میں معین ومددگار ہیں بلکہ انسانی معاشرہ کو مختلف وتعدد

---

[1] توضیح المسائل ص: ۴۴۶ و ۴۵۱

پیچیدگیوں اور مشکلات سے بچانیکے بھی آئینہ دار و ذمہ دار ہیں۔

حیوانات کیلیے نہ کوئی معاشرتی قانون ہے اور نہ تشکیل خاندان کی ضرورت اس لیے انہیں توالد و تناسل کے سلسلہ میں محرم و نامحرم کے حدود و قیود متعین ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ حیوانات ترکہ چھوڑتے ہیں کہ انکے ورثا میں تقسیم ہو لہذا انکے یہاں جنسی اباحیت پسندی پائی جانا کوئی خاص بات نہیں ہے، انسان کا معاملہ بالکل مختلف ہے، انسان مدنی الطبع ہے، یہ کچھ اپنے انفرادی حقوق و فرائض رکھتا ہے تو کچھ اسکے معاشرتی اجتماعی حقوق و فرائض ہیں۔

اسلام نے توالد و تناسل کیلیے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونیکا جو مہذب و شائستہ قانون تعلیم فرمایا ہے اسمیں انسانی معاشرہ کے سارے نشیب و فراز اور زندگی کے تمام شعبوں میں پیش آنیوالے جملہ واقعات و حالات اور مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ حدود و قیود متعین کیے ہیں، عہد حاضر میں توالد و تناسل کے مصنوعی ذرائع کا انھیں شرعی حدود و قیود کے مطابق جائزہ لینا ہوگا، چنانچہ:

اگر کسی عورت کا شوہر نامرد و ناکارہ ہو اور وہ عورت اجنبی مرد (غیر شوہر) کی منی انجکشن کے ذریعہ اپنے رحم میں داخل کرائے تو وہ فعل حرام کی مرتکب ہوگی، یہ کام خواہ اسکا شوہر انجام دے یا کوئی اور اجنبی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس طرح اگر

کوئی بچہ پیدا ہوگا تو وہ صاحب نطفہ اجنبی شخص کی اولاد شمار ہوگا۔ یہ بچہ ارث اور نسب کے تمام احکام میں اسکی باقی اولاد کے مانند ہوگا، میراث سے وہ بچہ مستثنیٰ رہتا ہے جو زنا سے پیدا ہو، لیکن یہاں مسئلہ اس سے جدا ہے، اگرچہ نطفہ منعقد کرنے کا یہ عمل حرام ہے عورت ایسے بچہ کی ماں قرار پائے گی اور تمام احکام نسب اسپر عاید ہوں گے، اسکے دیگر بچوں میں اور اس بچے میں کوئی فرق نہ ہوگا، اسی طرح اگر عورت اپنے شوہر کی منی کسی دوسری عورت کے رحم میں کسی طرح (مثلاً مساحقہ کے ذریعے) پہنچائے اور وہ عورت حاملہ ہو جائے تو پیدا ہونے والا بچہ اس شخص کا ہوگا جسکی یہ منی ہے، ماں اور بچے پر وہ تمام احکام لاگو ہوں گے جو عموماً ماں اور بچے میں ہوتے ہیں۔

اگر کسی مرد کی منی کو مصنوعی طور پر مصنوعی بچہ دانی (بے بی ٹیوب) میں بچہ پیدا کرنیکی غرض سے رکھدیا جائے تو یہ کام جائز ہے اور بظاہر بچہ اسی کا ہوگا جسکی منی ہو اور انکے درمیان وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو ایک باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بچے اور دوسرے بچوں میں صرف یہ فرق ہے کہ اسکی ماں نہیں ہے۔

شوہر کی منی زوجہ کے رحم میں مصنوعی طریقے (انجکشن وغیرہ) سے پہنچانا جائز ہے اور اس سے پیدا ہونیوالا بچہ عام اولاد کی طرح ہے، لیکن اگر انجکشن لگانیوالا اجنبی مرد ہو اور انجکشن عورت کی شرمگاہ کو دیکھنے یا چھونے کا سبب ہو تو یہ کام جائز نہیں ہے۔[۵]

---

۵ توضیح المسائل بحث مصنوعی ذریعہ تولید ص: ۳۸۵ و ۴۴۲

بیمہ

یوں تو انسان مدنی الطبع ہے ہی، لیکن "تعاونوا علی البر والتقوی"
(نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایکدوسرے کی مدد کرو) کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے امداد باہمی
کے طور پر آڑے وقت، دکھ تکلیف اور مصیبت میں ایکدوسرے کے کام آنے اور مدد کرنے کا
معاہدہ کریں تو یہ ایک مستحسن اقدام ہے، بیمہ بھی اسی جذبہ کی عکاسی اور اسی سلسلے کی
ایک کڑی ہے۔

بیمہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص ہر سال کچھ رقم بلا معاوضہ کسی فرد یا کسی
کمپنی کو دیتا رہے اور اس ضمن میں یہ شرط کرے کہ مثلاً اگر اسکی دکان یا مکان یا موٹر کار یا
خود اسے کسی قسم کا ضرر پہنچے تو وہ کمپنی یا فرد اس ضرر کی تلافی کرے یا اس ضرر کو دور
کرے یا اسکی بیماری کا علاج کرائیگی یہ معاملہ "ہبۂ معوضہ" میں داخل ہے اور اگر
اس شخص کو یا اسکی متعلقہ املاک کو کوئی ضرر پہنچے تو مشروط علیہ پر واجب ہے کہ طے شدہ
شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کرے اور جس شخص نے بیمہ کرا رکھا ہو اسکے
لیے رقم وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

بیمہ کے تمام اقسام کو مشروط بخشش قرار دیا جا سکتا ہے، یعنی پالیسی ہولڈر

بیمہ کمپنی کو اس شرط پر اقساط کی صورت میں ایک معین رقم بخشش (پریمیم) کے طور پر ادا کریگا کہ معاملہ کے ضمن میں مذکورہ نقصانات اگر پیش آئیں تو کمپنی انکا تدارک کریگی، اس صورت میں کمپنی پر واجب ہے کہ اس شرط پر عمل کرے۔ لہذا بیمہ کے تمام اقسام مذکورہ طریقہ پر شرعاً صحیح ہیں۔ [1]

—:—

---

[1] مسئلہ ۲۷۸۲ (توضیح المسائل آیۃ اللہ العظمیٰ الخوئی دام ظلہ)

آپریشن

عقلا کی نظر میں دو ہی علم اہمیت کے حامل ہیں: علم ادیان اور علم ابدان۔

اسلام نہ تنگ نظر ہے نہ متعصب، بلکہ وہ اپنے بارے میں دعوت فکر و نظر دیتا اور مذاہب کا مطالعہ کرنے اور حق و باطل کا موازنہ کرنیکی تعلیم دیتا ہے۔ اسی طرح بدن کی صحت اور بیماریوں سے چھٹکارا پانیکے لیے علاج کا حکم دیتا ہے، زندگی اور صحت قدرت کی امانت اور نعمت ہیں، اعضاء و جوارح کا صحیح و سالم ہونا الٰہی تفضل ہے۔ خالق کی عطا کردہ ساری نعمتوں، اسکی ودیعت کردہ جملہ امانتوں و قوتوں اور صلاحیتوں کی حفاظت عقل و فطرت کا تقاضہ ہے۔ خودکشی اسی لیے حرام ہے کہ یہ قدرت کی امانت میں خیانت ہے۔ اسی طرح کسی عضو یا قوت کو ناکارہ بنالینا یا بنا دینا نہ فقط کفران نعمت ہے، بلکہ اسکی غرض و غایت کو عبث قرار دینا ہے، ہاں اگر غیر اختیاری طور پر کسی عضو یا قوت میں نقص پیدا ہو جائے اور آپریشن کی ضرورت پیش آئے اور اسکے نتیجے میں وہ عضو ماؤف ہو جائے تو بات اور ہے ویسے کسی بیماری کے ازالہ، فاسد مادہ یا عضو فاسد نکالنے کیلیے آپریشن کرنے کرانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں، البتہ اگر کوئی یہ بات کہے یا اسپر راضی ہو کہ اسکا کوئی عضو اسکی زندگی میں کاٹ کر دوسرے کے جسم میں لگا دیا جائے تو اسکے متعلق مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

اگر یہ عضو، اعضائے رئیسہ میں ہو جیسے آنکھ، ہاتھ، اور پیر وغیرہ تو

جائز نہیں ہے اور اگر یہ اعضائے رئیسہ میں سے نہ ہو مثلاً کھال یا گوشت وغیرہ تو جائز ہے بخشش کے طور پر دے ہوئے حصے کا عوض لینا بھی جائز ہے۔

مسلمان میت کے کسی عضو مثلاً آنکھ وغیرہ کو اس غرض سے کاٹنا کہ اسے کسی زندہ شخص کے جسم سے ملحق کر دیا جائے، جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی مسلمان کی زندگی اس عضو کے کاٹنے پر موقوف ہو تو کاٹنا جائز ہے، مگر کاٹنے والے پر "دیت" واجب ہوگی۔ اگر کوئی شخص عضو کو جدا کرنے کی بنا پر حرام کا مرتکب ہو تو بنا بر ظاہر اس عضو کا زندہ شخص کے جسم سے الحاق جائز ہے اور چونکہ وہ زندہ شخص کے جسم کا جزو بن گیا اسلیے الحاق کے بعد اس پر زندہ جسم کے احکام عاید ہوں گے اور اگر مرنے والا اپنے عضو کے کاٹنے کی وصیت کرے تو بنا بر احتیاط ایسا کرنا جائز ہے اور کاٹنے والے پر دیت نہیں ہے۔

اسی طرح غیر مسلم میت کے اور اس میت کے اعضا کاٹ کر جس کا مسلمان ہونا مشکوک ہو، مسلمان کے جسم میں آپریشن کے ذریعے لگانا جائز ہے اور یہی حکم نجس حیوان کے اعضا کیلیے ہے یعنی اگر کسی شخص کو کسی نجس حیوان کا کوئی عضو کاٹ کر لگا دیا جائے تو وہ لگنے کے بعد اس شخص کا جزو بدن شمار ہوگا اور اس جزو کا ہونا اب نماز کیلیے مانع نہیں۔ ؎

؎ توضیح المسائل صفحہ ۴۴۳

مریض کو خون چڑھانا اور خون دینا

انسان کی جان اللہ کے نزدیک اتنی عزیز اور پیاری ہے کہ اگر فریضہ عبادت کی بجا آوری سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کسی کی حق تلفی کا امکان ہو تو خداوند عالم اپنا حق عبادت ساقط فرما دیتا ہے، ماہ مبارک رمضان کا واجب روزہ رکھنے سے اگر ماں کی گود میں پلنے والے شیر خوار بچے کیلیے دودھ نہ اترنے کا اندیشہ ہو، بچہ کی حق تلفی لازم آتی ہو تو ایسی صورت میں ماں سے روزہ ساقط ہی نہیں، بلکہ روزہ رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، تو وہ مہربان ذات جسے معصوم جان کا اتنا خیال ہو کہ اسکی معمولی سی حق تلفی نہ ہونے پائے، بھلا وہ کسی انسان کے ایثار و قربانی کے عمل کو کیسے پسند نہ فرمائے گا، انسانوں میں باہمی ایثار و قربانی، ہمدردی و مواسات کا جذبہ پیدا کرنے ہی کیلیے خالق نے اپنا حق ساقط فرمایا ہے چنانچہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کیلیے اپنا خون پیش کرتا ہے تو یہ ایک مستحسن اقدام ہے، اسلام اسے بنظر استحسان دیکھتا، ایسے شخص کو لائق تحسین و آفرین قرار دیتا ہے اور اگر اسکی اجرت و قیمت لینا چاہے تو اسے بھی معیوب نہیں سمجھتا۔

خون کھانا اور خون پینا یقیناً حرام ہے، مگر خون کھانا، خون پینا اور ہے، خون چڑھانا، چڑھوانا اور ہے۔

اصل مسئلے کی چار شقیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ ڈاکٹر کا کسی مریض کو خون چڑھانا

۲۔ کسی دوسرے شخص کا خون اپنے جسم میں چڑھوانا۔

۳۔ مریض کیلیے اپنا خون بطور عطیہ دینا۔

۴۔ مریض کیلیے اپنا خون قیمتاً دینا۔

چاروں صورتیں قیمت یا اجرت لے دے کر انجام پائیں تو بھی جائز ہیں اور اگر بلا اجرت و قیمت فی سبیل اللہ، خوشنودی خدا کے لیے بلا جبر و اکراہ انجام دی جائیں تو نہ صرف جائز بلکہ موجب اجر و ثواب بھی قرار پائیں گی، آیۃ اللہ العظمیٰ ابوالقاسم الخوئی ارشاد فرماتے ہیں:

"کسی مریض کو اپنا خون دیکر اسکا عوض لینا بھی اور کسی محتاج مریض کو اپنا خون مفت دینا بھی جائز ہے"۔ [۵]

—:—

---

[۵] توضیح المسائل ص: ۲۴۴

پوسٹ مارٹم

اسلام قبول کر لینے کے بعد انسان خداوند عالم کے نزدیک اتنا معزز و محترم ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کو اسکی توہین گوارہ نہیں ہے، چنانچہ جان کنی کے وقت سے لیکر غسل و کفن اور تجہیز و تدفین کی منزل تک قدم قدم پر میت کے احترام کو پیش نظر رکھا گیا ہے، پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام مسلمان میت کی چیر پھاڑ کی کھلی چھوٹ دیدے، اگر کوئی ایسی گستاخی کر بیٹھے تو اسپر "دیت" واجب ہے، ہاں اگر میڈیکل سائنس اور تشریح الاعضاء کی طبی تعلیم کیلیے تشریح میت ناگزیر ہو یا کسی مسلمان کی زندگی یا عزت و آبرو مسلمان میت کی تشریح پر موقوف ہو جائے تو ایسے حالات میں میت کا پوسٹ مارٹم شریعت اسلامیہ نے جائز قرار دیا ہے۔ [1]

---

[1] توضیح المسائل ص: ۴۴۱۔

انعامی ٹکٹ، لاٹری

کسی کو انعام، تحفہ یا بطور ہبہ کچھ دینا یا کسی سے قبول باہمی میل ملاپ اور محبت والفت پیدا کرتا ہے، لیکن بعض اوقات کسی کمپنی یا فرد کی طرف سے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں اور کمپنی معاہدہ کرتی ہے کہ جو انعام دیا جائے گا اسکے خریداروں کے درمیان قرعہ اندازی ہوگی۔ اس رائج الوقت مسئلے سے بھی اسلامی شریعت نے چشم پوشی نہیں کی ہے بلکہ انعامی ٹکٹ کی نوعیت کے اعتبار سے شرعی حکم کو واضح کر دیا گیا ہے:

اگر انعامی ٹکٹ کوئی شخص اس احتمال کی بنا پر خریدے کہ انعام میرے نام پر نکلے گا تو بلاشبہ ٹکٹ خریدنا حرام ہے۔ بالفرض اگر اس فعل حرام پر ٹکٹ نکل آیے تو اگر قسمت آزمانیوالی کمپنی حکومت کی طرف سے ہو تو انعام مجہول المالک کے حکم میں ہوگا یعنی حاکم شرع یا اسکے وکیل کی اجازت کے بغیر اس انعام کی رقم میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کمپنی عمومی ہو اور اسپر راضی ہو تو تصرف کرنا جائز ہے۔ اگر ٹکٹ خریدنے والا ٹکٹ کا پیسہ مفت دے مثلاً یہ قصد ہو کہ کسی خیراتی کام میں شرکت ہو اور انعام حاصل کرنا مقصد نہ ہو تو انعام اگر حکومت کی کمپنی کی طرف سے ہو تو حاکم شرع یا اسکے وکیل کی اجازت سے اسمیں تصرف جائز ہے اور اگر پرائیویٹ کمپنی ہو تو اسمیں تصرف کیلیے اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ٹکٹ خریدنے والا ٹکٹ کی قیمت قرض کی نیت سے دے اور اسے یہ حق ہو کہ قرعہ اندازی کے بعد دی ہوئی رقم واپس لیلے لیکن اس قرض کے دینے میں یہ شرط ہو کہ کمپنی سے ایک ٹکٹ بھی خریدے جسکے وسیلے سے قرعہ اندازی میں اسکا نام نکلنے پر اسے انعام دیا جائے تو معاملہ حرام ہے، کیونکہ یہ سود والے قرضے میں شمار ہوتا ہے۔

(توضیح المسائل، ص: ۴۴۵)

سود

"سود" ہر دور کا ایک زندہ مسئلہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے اس سے چشم پوشی کی ہو اور اسکے متعلق کوئی مثبت یا منفی قدم نہ اٹھایا ہو۔

سود کے مفاسد و عیوب اور اسکی حرمت کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ: سود کے معنی خرید و فروخت کے بغیر اصل مال سے زیادہ وصول کرنا ہے، یعنی بلا معاوضہ زیادتی، اس زیادتی کے مقابلہ میں کوئی شے نہ ہو، ورنہ کسی مال یا عمل کے مقابلہ میں وصول کی جانیوالی رقم کو زیادتی نہیں کہا جاتا۔

اسلامی شریعت میں سود کی دو قسمیں ہیں: معاملاتی سود اور قرضی سود

معاملاتی سود: دو ہمجنس چیزوں کی خرید و فروخت میں وصول کی جانیوالی زیادتی و اضافہ۔

قرضی سود: سرمایہ کے علاوہ مدت کے مقابلہ میں وصول کی جانیوالی زیادتی و اضافہ۔

یہ بات صحیح ہے کہ تجارت کی صورت میں "نفع" راس مال پر اضافی رقم کا حاصل ہونا ہے اور "سود" بھی اصل مال میں اضافہ کا نام ہے، مگر یہ اضافہ اور زیادتی دونوں جگہ ایک ہی نوعیت کی نہیں ہے، دونوں میں فرق ہے، سود اور تجارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تجارت میں معاوضہ کے طور پر رقم حاصل ہوتی ہے اور سود میں بلا معاوضہ رقم کمائی جاتی ہے نیز ہمجنس و ہم صفت مال کی شکل میں اضافہ چاہنا "سود" ہوتا ہے اور مختلف الجنس و مختلف الصفت شے کی صورت میں زیادتی "معاوضہ" ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سود اور تجارت کے فرق کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔